الرسالہ

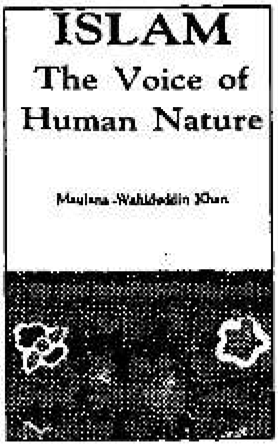
Al-Risala

February 1997 • No. 243 • Rs. 7

لڑنے کے میدان میں وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں
جو اِس سے پہلے
نہ لڑنے کے میدان میں کامیاب ہو چکے ہوں۔

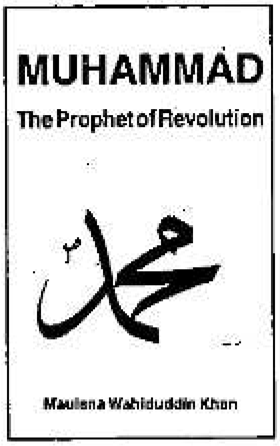


The Umayyad Great Mosque, Damascus



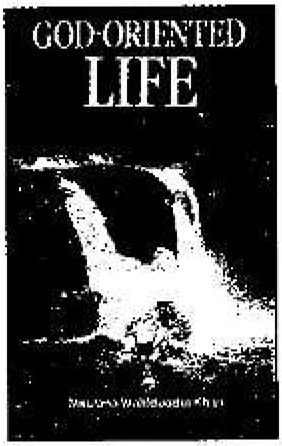
ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE

22×14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30



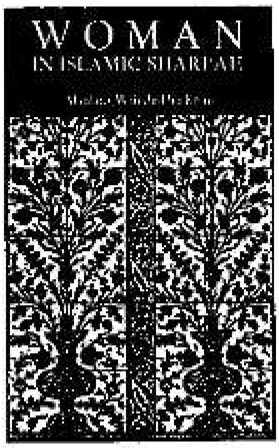
MUHAMMAD: THE PROPHET OF REVOLUTION

22×14.5cm, 228 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 85



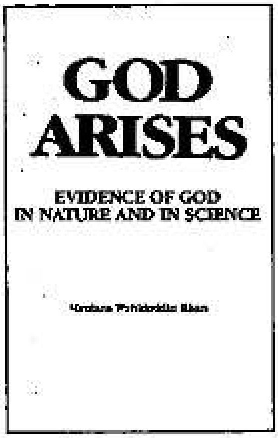
GOD-ORIENTED LIFE

22×14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70



WOMAN IN ISLAMIC SHARI'AH

22×14.5cm, 150 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 185 (Hardbound)



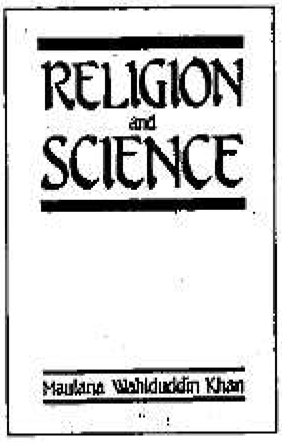
GOD ARISES

22×14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85



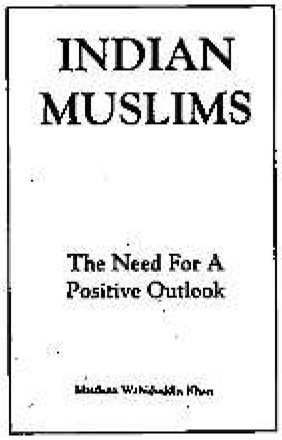
ISLAM AS IT IS

22×14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55



RELIGION AND SCIENCE

22×14.5cm, 96 pages
Rs. 45



INDIAN MUSLIMS

22×14.5cm, 192 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 175 (Hardbound)

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (46 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (36 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire.

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013 Tel. 4611128 Fax: 11-4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

فروری ۱۹۹۷، شمارہ ۲۴۳

فہرست — صفحہ

فہرست	صفحہ
اسلامی تیوہار	۴
عید اضحیٰ	۸
حج اور قربانی	۱۲
صحیح رہنمائی	۱۶
سفرنامہ یورپ — ۳	۲۰

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

اسلامی تیوہار

تیوہار اجتماعی خوشی کا دن ہے۔ یہ انسان کی اور انسانی سماج کی ایک فطری ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اور ہر سماج میں تیوہار کا رواج کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے۔

عام حالات میں لوگ اپنی اپنی ذمہ داریوں میں اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے لئے بے تکلف انداز میں اجتماعی ملاقات کا ایک موقع ہو۔ تیوہار اسی قسم کا ایک موقع فراہم کرتے ہیں جب کہ کسی بستی یا کسی انسانی گروہ کے لوگ آپس میں کھلے طور پر ملتے ہیں اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں بے تکلف حصہ دار بنتے ہیں۔

اسی طرح موجودہ دنیا میں آدمی اکثر کسی نہ کسی سبب سے ذہنی تناؤ میں رہتا ہے۔ حتی کہ اگر کسی کو راحت و آرام کے سارے سامان حاصل ہوں تب بھی کچھ عرصہ کے بعد وہ اس نفسیاتی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کو اکتاہٹ (بورڈم) کہا جاتا ہے۔ اس عمومی صورت حال نے بھی تیوہار کو ہر قوم اور ہر سماج کی فطری ضرورت بنا دیا ہے تاکہ لوگ اکٹھا ہو کر اپنے غموں کو بھلائیں، ایک دوسرے سے مل کر اپنے ذہنی بوجھ کو ہلکا کریں۔

یہ تیوہار اکثر کسی خاص قومی دن میں یا کسی یادگار تاریخ پر رکھے جاتے ہیں۔ ہر قوم اپنے تاریخی دنوں میں اپنا تیوہار مناتی ہے۔ چنانچہ سال کی اکثر تاریخوں میں کسی نہ کسی قوم کا تیوہار کسی نہ کسی مقام پر جاری رہتا ہے (تفصیلی فہرست کے لئے (مائیکرو پیڈیا ۴/۳ ۷-۷۵)

ان تیوہاروں میں عام طور پر کھیل کود ہوتا ہے۔ تفریحی پروگرام کئے جاتے ہیں۔ عام سماجی روایات کی حدود کو توڑ کر لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔ ان میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی یا سیکولر ہوں۔

مسلمانوں کے لئے اس قسم کے دو تیوہار مقرر کئے گئے ہیں ــــ عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ مسلمانوں کے لئے مذہبی اعتبار سے یہ دو سالانہ خوشی کے دن ہیں۔ عید الفطر شوال کی پہلی تاریخ کو آتی ہے اور عید الاضحیٰ ذوالحجہ کی ۱۰ تاریخ کو۔

مکی دور میں باقاعدہ اسلامی سماج نہیں بنا تھا۔ اس لئے مکی دور میں عیدین کے یہ تیوہار

بھی مقرر نہیں ہوئے تھے۔ منظم اسلامی معاشرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں بنا۔ اس وقت جس طرح دوسرے اجتماعی نظام بنائے گئے، اسی طرح عیدین کا نظام بھی قائم کیا گیا۔

اس زمانہ میں مدینہ کے لوگوں میں دو قبائلی تیوہاروں کا رواج تھا۔ اس دن وہ لوگ کھیل کے مقابلے کرتے تھے۔ شعروشاعری کی محفلیں سجاتے تھے۔ تاریخی فخروالی چیزوں کی نمائش کرتے تھے۔ مجموعی اعتبار سے اس تیوہار کو ایک قسم کا قومی میلہ کہا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مکہ سے مدینہ آئے اور آپ نے وہاں کے تیوہاروں کو دیکھا تو آپ نے ان کے بجائے عیدین کی صورت میں دو تیوہار مقرر کئے۔ ایک صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو اس وقت اہل مدینہ کے دو سالانہ دن تھے۔ ان میں وہ کھیل کود کرتے تھے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ تمہارے دو دن کیا ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ یہ یہاں کا پرانا رواج ہے۔ ان دنوں میں ہم لوگ کھیل کود کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے ان دو دنوں کے بدلے تم کو زیادہ بہتر دو دن دئے ہیں۔ یہ دو دن یوم الاضحیٰ اور یوم الفطر ہیں (سنن ابی داؤد ۱/۲۹۴)

عیدین کے یہ تیوہار گویا تیوہار کے قدیم جاہلی طریقوں کا اسلامائزیشن ہیں۔ تیوہار کا اصل مقصد اجتماعی خوشی ہے۔ اس کو عیدین میں پوری طرح باقی رکھا گیا۔ البتہ اس میں غیر سنجیدہ قسم کے کھیل کود کو گھٹا کر اس کی جگہ مہذب خوشی اور سنجیدہ تفریح کا اضافہ کر دیا گیا۔

عیدین کے سلسلہ میں مختلف روایتیں جو حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں، ان کی بیشتر تعداد کو مشکاۃ المصابیح میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ان کو صلاۃ العیدین میں اور بعض دوسرے ابواب کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔

پہلی بات یہ کہ عید کے تیوہار کو قمری کیلنڈر کے ہلال سے جوڑ دیا گیا۔ اس طرح نئے چاند کا ظہور تیوہار کی آمد کا ایک آسمانی اعلان بن جاتا ہے۔ تاہم اس خوشی کا رخ اعلیٰ انسانی قدروں کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہلال کو دیکھا تو یہ دعائیہ کلمات آپ کی زبان سے نکلے: اَللّٰھُمَّ اھلہ علینا بالامن والایمان والسلامۃ والاسلام، ربی وربک اللہ۔ (مشکاۃ المصابیح ۲/۷۵۱) یعنی اے اللہ، اس چاند کو ہمارے لئے

امن اور یقین کا چاند بنا دے۔ اس کو سلامتی اور اطاعت کا چاند بنا دے۔ میرا رب بھی اللہ ہے، اور اس چاند کا رب بھی اللہ۔

یہ دعا بتاتی ہے کہ عید کا چاند دیکھ کر لوگوں کے اندر کس قسم کے احساسات وجذبات پیدا ہونے چاہئیں۔ وہ یہ کہ ہمارے اندر یہ تمنا ابل پڑے کہ آنے والے دن ہمارے لئے اور ساری انسانیت کے لئے امن کے دن ہوں۔ جب کہ تمام لوگوں کو صحت وسلامتی کی نعمتیں حاصل ہوں۔ انسانی خوشیوں میں چاند کی شرکت کو دیکھ کر انسان کے اندر یہ احساس جاگ اٹھے کہ پوری کائنات ایک وسیع خدائی عیال ہے۔ اس میں انسان سے لے کر آسمانی اجرام تک سب شامل ہیں۔ سب ایک ہیں، اس لئے کہ سب کا خدا ایک ہے۔

پھر جب صبح آتی ہے تو تمام بڑے اور بچے، عورتیں اور مرد نہا دھو کر صاف کپڑے پہنتے ہیں۔ اپنی پسندیدہ خوراک کھا کر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد گھر سے چل کر کسی کھلے میدان میں پہنچتے ہیں۔ اور وہاں دو رکعت شکر کی نماز پڑھتے ہیں۔ اس طرح گویا وہ اقرار کرتے ہیں کہ جس خدا نے خوشی کا موقع دیا ہے، وہی خدا اس قابل ہے کہ اس کے لئے اس کا شکر ادا کیا جائے۔ نماز کے بعد امام خطبہ دیتا ہے جس میں نصیحت کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ خوشی ہر انسان کا حق ہے۔ مگر خوشی کو ذمہ داری کے حدود میں رہ کر منانا چاہئے۔

اس کے بعد لوگ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحفہ دیتے ہیں۔ سلامتی اور مبارکبادی کے کلمات کے ساتھ ایک دوسرے کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ خوشی مناتے ہیں مگر اس طرح کہ ایک کی خوشی دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث نہ ہو۔ وہ خوشی مناتے ہیں مگر ان کی خوشی میں شور وغل نہیں ہوتا۔ وہ خوشی مناتے ہیں مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ راستوں میں کوئی گندگی نہ پھیلے۔ ان کی خوشی پڑوسیوں کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہ کرے۔ وہ خوشی مناتے ہیں مگر اس طرح کہ مقصدیت کا عنصر کسی طرح اس سے حذف نہ ہونے پائے۔

اسلامی تیوہار کے دن جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے، ان میں سے ایک صدقہ ہے۔ نقد کی صورت میں بھی اور کھانے پینے کی چیزوں کی صورت میں بھی۔ یہ گویا انفرادی خوشی کی اجتماعی توسیع ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر ایک کو خوشی منانے کے اسباب مہیا کئے جائیں۔ سماج میں کوئی ایسا نہ رہے

جو خوشی کے اسباب سے محروم ہو۔ جو اپنی خوشی کی مادی قیمت دینے سے عاجز ہو جائے۔

صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئے۔ اس وقت دو لڑکیاں حضرت عائشہ کے پاس بیٹھی ہوئی دُف بجا رہی تھیں اور عربی گانے گا رہی تھیں۔ حضرت ابو بکر نے ان کو ڈانٹا کہ رسول کے گھر میں تم لوگ گانے بجانے کا لغو کام کر رہی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے چہرہ سے چادر ہٹائی اور فرمایا کہ اے ابو بکر، انھیں چھوڑ دو، ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور آج ہماری عید ہے (فتح الباری ۲/۵۱۶)

اسلام میں خوشی منانے کو تہذیب اور انسانیت کی حد میں رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاہم خوشی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ حد کی پابند نہیں رہتی۔ وفور شوق میں کبھی کبھی کوئی شخص تجاوز بھی کر جاتا ہے۔ اس لئے حد بندی کے ساتھ اسلام میں انسانی جذبات کی رعایت بھی رکھی گئی ہے۔ اور وہ رعایت یہ ہے کہ اگر کوئی عورت یا مرد وقتی جذبہ کے تحت کچھ سادہ قسم کی بے ضرر تفریح کرلیں تو سماج کے بڑوں کو چاہئے کہ وہ اسے نظر انداز کریں۔ وہ اس قسم کی معصومانہ خوشی پر روک لگانے کی کوشش نہ کریں۔

ایک بزرگ نے کہا: لیس العید لمن تزیّن بزینة الدنیا، انما العید لمن تزوّد بزاد التقوی۔ یعنی عید اس کی نہیں ہے جو دنیا کی زینت سے اپنے آپ کو سنوارے بلکہ عید اس کی ہے جو آخرت کے لئے تقویٰ کا زاد راہ اکٹھا کرلے۔

اس قول سے اسلامی تیوہار کی اصل روح معلوم ہوتی ہے۔ اسلامی تیوہار وہ ہے جس میں خوشی کے ساتھ خدا کا شکر شامل ہو جس میں کھیل کے ساتھ اعتدال موجود ہو۔ جس میں بے تکلفی ہو مگر وہ ادب کے دائرہ میں ہو۔ جس میں کھانا پینا ہو مگر وہ اسراف سے پاک ہو۔ جس میں انسانی جذبات کی رعایت ہو مگر وہ خدائی احکام کے ماتحت ہو۔ جس میں تفریح ہو مگر اسی کے ساتھ اس میں مقصدیت بھی پوری طرح برقرار رہے۔

یہ ہے عید، اور یہ ہے تیوہار کا اسلامائزیشن۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۱ فروری ۱۹۹۶ کو نشر کیا گیا۔

عید اضحیٰ

عید اضحیٰ کے معنی ہیں قربانی کی عید۔ اس سالانہ تیوہار کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر قربانی کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔ تاہم اس قربانی کا اصل مطلب جانور کو ذبح کرنا نہیں ہے۔ جانور کا ذبیحہ اصل قربانی کی علامت ہے نہ کہ وہی اصل قربانی ہے۔

قربانی حضرت ابراہیم کی یادگار ہے۔ اسی کو ہر سال، ہم اپنی زندگی میں دہراتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ کیا تھا۔ حضرت ابراہیم سے اللہ تعالیٰ کو ایک خاص منصوبہ مکمل کرانا تھا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ آپ کے بیٹے اسماعیل کو عرب کے غیر آباد علاقہ میں بسا دیا جائے جہاں اس وقت صحرا اور پہاڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں فطرت اور جفاکشی کے ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ ایک تازہ دم اور جاندار نسل تیار ہو جس میں اعلیٰ انسانی اوصاف ہوں۔ جس کے اندر ہر قسم کی عملی صلاحیت پائی جائے۔ اس طرح کی ایک زندہ نسل تیار کر کے اس کو نیا انقلاب برپا کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ وہ آنے والے مصلح اعظم کو انسانوں کی ایک طاقت ور ٹیم دے سکے۔

قدیم عرب کے ماحول میں کسی بچہ کو بسانا اس کو گویا ذبح کر دینا تھا۔ یہی حقیقت حضرت ابراہیم کو خواب میں اس طرح دکھائی گئی کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ یہ ایک تمثیلی خواب تھا۔ مگر حضرت ابراہیم کمال اطاعت کے جذبہ کے تحت حقیقی طور پر اس کی تعمیل کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح آخری طور پر ثابت ہو گیا کہ آپ اپنی اولاد کو خدا کے مذکورہ منصوبہ میں دینے کے لئے بلا جھجک آمادہ ہیں۔

اس وقت اللہ کی طرف سے ایک دنبہ دیا گیا اور حضرت ابراہیم سے کہا گیا کہ اس دنبہ کو فدیہ کے طور پر ذبح کر کے اپنا خواب پورا کرو اور اپنے بیٹے کو اصل قربانی کے لئے صحرا میں بسا دو۔ وہاں کے پر مشقت ماحول میں ایک نئی نسل بنے گی۔ اور جب یہ نسل تیار ہو جائے گی تو وہ اپنی جد وجہد سے ایک عظیم انقلاب لائے گی اور دنیا کو ایک نئے دور میں داخل کرے گی۔ چنانچہ اسی نسل سے صحابۂ کرام نکلے جو اعلیٰ ترین انسانی کردار کے حامل تھے اور انھوں نے دنیا میں

اعلیٰ ترین انقلاب برپا کیا۔

عید اضحیٰ اسی ابراہیمی تاریخ کو تیوہار کی صورت میں دہرانے کا دن ہے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے وقت میں اس کو ایک خاص صورت میں دہرایا۔ آئندہ بھی یہ ابراہیمی عمل جاری رہے گا۔ البتہ اس کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

عید اضحیٰ کے موقع پر جب ایک شخص جانور کو ذبح کرتا ہے تو وہ اپنی زبان سے عربی کے وہ الفاظ کہتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: بے شک میری عبادت اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ خدایا، تجھی نے دیا ہے اور تجھی کو میں اسے لوٹاتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی قربانی تو خود اپنی ذات کی ہے۔ اصل قربانی یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کو بچائے بغیر اس کو خدا کے حوالے کر دے۔ وہ اپنے وجود کی حوالگی کے لئے خدا سے عہد کرتے ہوئے بطور علامت ایک جانور کو ذبح کر رہا ہے، جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو خدا کے منصوبہ کے حوالے کرتے ہوئے ایک جانور کو فدیہ کے طور پر ذبح کیا تھا۔ حضرت ابراہیم کے لئے دنبہ کو ذبح کرنا علامتی معنوں میں تھا۔ اسی طرح آج عید اضحیٰ کے موقع پر یا حج کے موقع پر جانور کو ذبح کرنا بھی ایک علامتی عمل ہے نہ کہ وہی اصل عمل۔

علامتی ذبیحہ کے لئے جانور کا انتخاب سب سے زیادہ فطری انتخاب ہے۔ یہ گویا معمول کے حالات کو ایک غیر معمولی سبق کے لئے استعمال کرنا ہے۔ خدائی شریعت کے مطابق، آدمی بار بار ایسا کرتا ہے کہ وہ جانور کو اپنی خوراک کے لئے ذبح کرتا ہے۔ اسی عمل کو ایک دن نیا عنوان دے دیا گیا۔ گویا کہ ایک ہونے والی بات میں مزید ایک سبق کا پہلو پیدا کر دیا گیا۔

عید اضحیٰ اسی ابراہیمی تاریخ کو تیوہار کی صورت میں دہرانے کا دن ہے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے وقت میں اس کو ایک خاص صورت میں دہرایا۔ آئندہ بھی یہ ابراہیمی عمل جاری رہے گا، البتہ اس کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس کی علامتی صورت تو ہمیشہ ایک رہے گی۔ یعنی عید قرباں کے موقع پر جانور کو ذبح کرنا۔ مگر اسپرٹ کے اعتبار سے اس کی صورتیں ایک سے زیادہ ہوسکتی ہیں۔ جس وقت اسلام کو جس قسم کی مشقت اور قربانی مطلوب ہو، اس

وقت اس کی تعمیل کی جائے گی۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں اسلام کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلم قوم کے تقریباً تمام اعلیٰ صلاحیت والے لوگ حب عاجلہ میں بتلا ہیں۔ وہ آجلہ کے لئے عمل کرنے پر راضی نہیں۔ وہ شہرت کے میدانوں میں اپنی ساری طاقت لگا رہے ہیں۔ وہ کام جو اخبار میں چھپے، جس سے فوراً لیڈری ملتی ہو۔ جو آدمی کو عمومی سطح پر باعظمت مقام دیتا ہو۔ آج تمام اعلیٰ صلاحیت کے لوگ اسی قسم کے کاموں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ وہ سنجیدہ اور خاموش تعمیری کام میں اپنے آپ کو وقف کرنے کے لئے تیار نہیں۔

لوگ عید اضحیٰ کے موقع پر جانور کی قربانی کرتے ہیں۔ مگر حقیقی قربانی کا میدان جہاں انھیں اپنی ذات کو اور اپنی صلاحیتوں کو وقف کرنا چاہئے، وہاں اپنے آپ کو وقف کرنے کے لئے تیار نہیں۔

آج اسلام کے لئے اسی قسم کی قربانی کی ضرورت ہے۔ آج ضرورت ہے کہ دنیا کی ترغیبات کو چھوڑ کر آخرت کی ابدی نعمتوں کے لئے قربانی دی جائے۔

اس مطلوب عمل کی علامت کے لئے جانور کی قربانی کا طریقہ اختیار کرنا گویا ہماری عام زندگی میں اس کو شامل کر دینا ہے۔ خدا کی شریعت کے مطابق، آدمی بار بار ایسا کرتا ہے کہ وہ جانور کو اپنی خوراک کے لئے ذبح کرتا ہے۔ عید اضحیٰ کے موقع پر جانور کے اسی ذبیحہ کو ابراہیمی یادگار کے طور پر بطور علامت انجام دینے کا حکم دیدیا گیا۔ اس طرح ایک ہونے والی بات کو مزید ایک اعلیٰ سبق کا ذریعہ بنا دیا گیا۔

عید اضحیٰ کے دن صبح کو دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد جانور کی قربانی دی جاتی ہے۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو اظہار ہیں۔ نماز بھی حوالگی اور سپردگی کا عہد ہے اور قربانی بھی حوالگی اور سپردگی کا عہد۔ نماز میں رکوع اور سجدہ کے ذریعہ اپنی حوالگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور قربانی میں جانور کے ذبیحہ کی صورت میں۔ گویا نماز کے ذریعہ آدمی یہ کہتا ہے کہ جہاں مجھ کو خدا کے آگے جھکنا ہوگا وہاں میں جھک جاؤں گا، اور قربانی کے ذریعہ وہ کہتا ہے کہ جہاں مجھے اپنی جان پیش کرنی ہوگی وہاں میں اپنی جان پیش کر دوں گا۔

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۸ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تبعیت میں آپ کی پوری امت کو قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سورہ کا ترجمہ یہ ہے :

ہم نے تم کو کوثر دے دیا۔ پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ بے شک تمہارا دشمن ہی بے نام ونشان ہے (الکوثر)

کوثر کے معنی خیر کثیر کے ہیں۔ یعنی بہت زیادہ بھلائی اور بہتری۔ پیغمبر اسلام کو یہ خیر کثیر اپنے کمال درجہ میں دیا گیا۔ بعد کے امتیوں کو وہ ان کے عملی استحقاق کے اعتبار سے دیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے آمیز حق کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ اس قسم کا کام ہمیشہ قربانی کی سطح پر انجام دیا جاتا ہے۔ یہ کام بلاشبہ اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ یہ مشکل ترین کام آپ نے عظیم ترین قربانی کے ذریعہ انجام دیا۔ حتی کہ اس دعوت کی راہ میں آپ کو اپنی ہر چیز کھو دینی پڑی۔

آپ اپنی قوم سے کٹ گئے، آپ کی معاشی زندگی برباد ہو گئی۔ آپ کی اولاد کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ تھوڑے لوگوں کے سوا کسی نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔ مگر آپ ہر قسم کی قربانی دیتے ہوئے اس پر قائم رہے، یہاں تک کہ اللہ کی طرف سے آپ پر یہ بشارت اتری کہ تم کو کوثر (خیر کثیر) دے دیا گیا۔ ہر قسم کی اعلیٰ ترین کامیابی دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے ابدی طور پر لکھ دی گئی۔ قرآن کی یہ پیشین گوئی بعد کے سالوں میں کامل طور پر آپ کے حق میں پوری ہوئی۔

عید اضحیٰ اسی قربانی کے عہد کا دن ہے جو تمام اعلیٰ کامیابیوں کا زینہ ہے۔ اس دنیا میں وہی لوگ بڑا درجہ حاصل کرتے ہیں جو اس کے لئے تیار ہوں کہ وہ ہر حال میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں گے۔ وہ مشقتوں اور قربانیوں کی قیمت دے کر اپنے فرض منصبی کو ادا کریں گے۔

نوٹ : یہ تقریر ۲۳ جون ۱۹۹۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

حج اور قربانی

حج کی اصل حقیقت قربانی ہے۔ حج کے تمام اعمال میں جو روح کام کر رہی ہے وہ قربانی کی روح ہے۔ حج کے موقع پر جانور کی قربانی اسی حقیقت حج کا علامتی اظہار ہے۔ بظاہر آدمی ایک جانور کو لٹا کر اس کو ذبح کرتا ہے۔ مگر جانور کی قربانی دراصل اپنی جان کے بدل کے طور پر ہے۔ حقیقی قربانی یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ میں نے خود اپنے آپ کو آخری حد تک اللہ کے حکم کے آگے ڈال دیا ہے۔ اس کے لئے جانور کے اوپر چھری رکھنا خود اپنی ذات کے اوپر چھری رکھنے کے ہم معنی بن جائے۔

حج کی یہ حقیقت اس دعا سے بخوبی طور پر واضح ہے جو جانور کی قربانی کرتے ہوئے آدمی اپنی زبان سے ادا کرتا ہے۔ وہ یہ ہے —— بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو سارے عالم کا پروردگار ہے۔

حج از اول تا آخر قربانی کا سبق ہے۔ حج میں آدمی کو اپنے کام اور اپنی مشغولیت کو چھوڑ کر نکلنا پڑتا ہے، یہ وقت کی قربانی ہے۔ وہ اپنے وطن سے روانہ ہو کر دور کے سفر پر جاتا ہے، یہ معمولات کو توڑنے کی قربانی ہے۔ وہ اپنے روزمرہ کے اخراجات میں ایک نئے خرچ کا اضافہ کرتا ہے، یہ مال کی قربانی ہے۔ وہ طواف اور سعی میں اپنے اعضا کو تھکاتا ہے، یہ جسم کی قربانی ہے۔ وہ مسلسل اللہ کو یاد کرتا ہے اور اس کے آگے گریہ وزاری کرتا ہے، یہ اپنی انا کی قربانی ہے۔

اسی کے ساتھ حج کے سفر میں بہت سے اجنبی لوگوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ اس میں طرح طرح کی ناخوشگوار باتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی کوئی شخص کڑوی بات بولتا ہے۔ کبھی کسی آدمی سے دھکا لگ جاتا ہے۔ کبھی کسی شخص سے کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح کے ناموافق تجربات اس کے جذبات کو مشتعل کر دیتے ہیں۔ مگر وہ حکم خداوندی کی بنا پر اس قسم کی تمام چیزوں کو برداشت کرتا ہے۔ یہ احساسات کی قربانی ہے جو بلاشبہ تمام قربانیوں سے زیادہ بڑی قربانی ہے۔

اس طرح حج گویا قربانی کی مشق اور قربانی کی تربیت ہے۔ حج آدمی کو جسمانی اور

روحانی اور مالی شدائد کے مختلف مراحل سے گزار کر اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ایک باعمل انسان بنے۔ سفرِ حیات میں وہ قربانی کی حد تک اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔

حج کوئی جامد قسم کی رسم نہیں۔ وہ ایک زندہ اور بامعنی عمل ہے۔ حج اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے اس بات کا پیغام ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر حال میں بامقصد زندگی گزارے، خواہ اس کو اس مقصدیت کی کتنی ہی زیادہ قیمت کیوں نہ دینی پڑے۔ حج کے مراسم گویا بامقصد زندگی کا ریہرسل ہیں جو علامتی انداز میں مخصوص تاریخوں میں دہرائے جاتے ہیں۔ یہ علامتی ریہرسل اس لئے کرایا جاتا ہے تاکہ آدمی اپنے ماحول میں واپس آکر اس کو حقیقی طور پر اپنی زندگی میں دہرائے۔

بامقصد زندگی کی اس تربیت کے لئے ایک ایسے انسان کا نمونہ منتخب کیا گیا ہے جو اس معاملہ میں آئیڈیل انسان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ آئیڈیل اور تاریخی شخصیت حضرت ابراہیم کی شخصیت ہے۔

حضرت ابراہیم کا زمانہ چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ انھوں نے اللہ کی خاطر پورے معنوں میں ایک بامقصد زندگی گزاری۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو شرک سے ہٹا کر توحید کے عقیدہ پر قائم کیا جائے۔ اس پاک مقصد نے جن جن قربانیوں کا تقاضا کیا، وہ ساری قربانیاں انھوں نے پیش کیں۔

اس آئیڈیل انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کو حج میں علامتی طور پر دہرایا جاتا ہے۔ اس طرح حاجی کے اندر یہ عزم بیدار کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں مقصدِ حق کے لئے جئے اور مقصدِ حق کے لئے مرے۔ جس طرح حضرت ابراہیم ساری عمر مقصدِ حق کے لئے جئے۔ اور آخر میں اپنے عزیز بیٹے کو اسی کے لئے قربان کر دیا۔ حضرت ابراہیم نے ہر مطلوبہ قیمت ادا کی مگر وہ اس مقصد سے نہیں ہٹے جو اللہ نے انھیں بتایا تھا۔ اسی طرح حاجی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ہر ضروری قیمت ادا کرے۔ مگر مقصد کی شاہراہ کو کبھی نہ چھوڑے۔

ہر زمانہ میں ایک ابراہیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اس انسان کی جو لوگوں کی بھلائی

کے لئے تڑپے۔ جو لوگوں کو سچائی کا راستہ دکھانے کے لئے بلا معاوضہ محنت کرے۔ جو اپنا سب کچھ کھوئے تاکہ دوسرے لوگ پانے والے بن جائیں۔ حج کے مراسم کے دوران یہی جذبہ ہر ایک حاجی کے اندر ابھارا جاتا ہے، اور اسی جذبہ کو لے کر اسے مقامات حج سے واپس آنا ہے۔

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں لوگ خدا کو بھولے ہوئے تھے۔ وہ خدا کو چھوڑ کر خدا کی مخلوقات کو پوجتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے ان کے درمیان توحید کی تبلیغ کی۔ مگر لمبی مدت تک کوشش کرنے کے باوجود لوگ شرک کے راستہ سے نہیں ہٹے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نسل درنسل مشرکانہ تہذیب میں زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ اس کے رنگ میں اتنا رنگ گئے تھے کہ ان کا ذہن کوئی دوسری چیز قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے اسماعیل اور ان کی ماں ہاجرہ کو عرب کے غیر آباد صحرا میں بسا دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ صحرا کے الگ تھلگ ماحول میں پرورش پا کر ایسے لوگ نکلیں جو اپنی فطرت پر قائم ہوں اور توحید کے فطری پیغام کو قبول کر سکیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ڈھائی ہزار سال کے دوران توالد وتناسل کے ذریعہ صحرائی ماحول میں ایک تازہ دم قوم تیار ہوئی جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ یہی لوگ دین توحید کو قبول کر کے اصحاب رسول بنے اور ساری دنیا میں ایک نیا انقلاب برپا کر دیا۔

موجودہ زمانہ میں دوبارہ مذہب توحید کو زندہ کرنے کے لئے ایک جاندار قوم کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے دوبارہ قربانیوں کی ضرورت ہے۔ اب موجودہ حالات کے لحاظ سے جو لوگ دوبارہ یہ کام کریں وہی سچے اور مکمل حاجی ہیں۔

آج جو لوگ حج کے لئے جاتے ہیں، ان کو حج کا پیغام یہی ہے۔ ان کو دوبارہ اپنے اندر توحید کی روشنی جلانا ہے۔ ان کو دوبارہ اپنے اندر ابراہیمی کردار پیدا کرنا ہے۔ ان کو دوبارہ اللہ کے گرد گھومنے والا اور اللہ کے لئے دوڑنے والا بننا ہے۔ ان کو اختلافات سے بلند ہو کر اللہ کی خاطر متحد ہو جانا ہے۔ ان کو قربانی کی قیمت دے کر اس مقصد کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔

حضرت ابراہیم نے قدیم حالات کے اعتبار سے جو حق پرستانہ کردار ادا کیا تھا، آج حاجی کو وہی حق پرستانہ کردار موجودہ حالات کے اعتبار سے ادا کرنا ہے۔ یہی حج کا پیغام ہے اور یہی حج کا فریضہ ادا کرنے والوں کا پروگرام۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حج کے زمانہ میں جو جانور ذبح کیا جاتا ہے تو اللہ کو اس کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ اللہ کو اس کا تقویٰ پہنچتا ہے (الحج ۳۷) گویا کہ جانور کا ذبیحہ ایک علامتی عمل ہے، اس کے ذریعہ جو اصل چیز مطلوب ہے، وہ یہ کہ ذبیحہ دینے والے کے اندر تقویٰ کی اسپرٹ پیدا ہو۔

یہی حج کے تمام مراسم کا معاملہ ہے۔ حج کے تمام مراسم علامتی مراسم ہیں۔ وہ علامتی طور پر یہ سبق دیتے ہیں کہ اپنے اندر اسی قسم کی روح پیدا کرو۔ اس ظاہر کو اپنے باطن میں اتار لو۔

علامتی عمل ہمیشہ ایک رہتا ہے۔ مگر اس کی روح کا ظاہری استعمال کیا ہو، اس میں زمانہ کے اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے۔ حاجی کے اندر حقیقی معنوں میں اگر حج کی روح پیدا ہو جائے تو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ وہ جن حالات میں ہے، اس کے اعتبار سے وہ کون سی قربانی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اس سے مطلوب ہے۔

سچا حاجی وہ ہے جس کے لئے حج کے مراسم اس کے اندر حج کی مطلوب روح پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ جو نہ صرف "ذوالحجہ" کا حاجی ہو بلکہ وہ پوری عمر اور پوری زندگی کا حاجی بن جائے۔

صحیح رہنمائی

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا سبب مسلمانوں کے درمیان قیادت کا فقدان ہے۔ مگر حقائق کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک بالکل بے بنیاد مفروضہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ قیادت کا فقدان نہیں بلکہ اتباع قیادت کا فقدان ہے۔ مسلمانوں میں صحیح رہنمائی دینے والے قائد پیدا ہوئے۔ مگر قوم نے ان کا اتباع نہیں کیا۔ اور جب قوم صحیح قائد کا اتباع نہ کرے تو اس کی رہنمائی کا فائدہ قوم کو کس طرح مل سکتا ہے۔

یہاں میں سرسید احمد خاں (۱۸۹۸-۱۸۱۷) کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ انھوں نے واضح طور پر قوم کو ایک رہنمائی دی۔ بعد کے تجربات نے بتایا کہ یہ رہنمائی درست تھی۔ مگر بہت تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر قوم نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ انھیں کافر اور گمراہ اور دشمنوں کا ایجنٹ بتایا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو سرسید کی رہنمائی کا فائدہ نہیں مل سکتا تھا۔ اور نہ انھیں اس کا فائدہ ملا۔

۱۸۵۷ کے حادثہ کے وقت سرسید کی عمر تقریباً ۴۰ سال تھی۔ مسلمانوں نے اس وقت انگریزوں سے لڑائی کی۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو بری طرح شکست ہوئی۔ ۵۸-۱۸۵۷ کی جنگ مسلمانوں کو کچھ دے تو نہ سکی۔ البتہ انقلابات زمانہ کے باوجود جو کچھ ان کے پاس باقی رہا تھا وہ بھی ان سے چھین لیا۔ مسلمان ہر اعتبار سے ایک برباد کمیونٹی بن کر رہ گئے۔

سرسید نے ان حالات کو دیکھا۔ وہ ان سے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے ۷۰-۱۸۶۹ میں انگلینڈ کا سفر کیا۔ وہاں انھوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ یورپ کے غلبہ اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مغلوبیت کا راز کیا ہے۔ سرسید نے نہایت درست طور پر جانا کہ اس کا سبب حقیقۃً اغیار کی سازش نہیں ہے بلکہ خود مسلمانوں کی یہ کمی ہے کہ وہ جدید دور کی تعلیم میں دنیا سے پیچھے رہ گئے۔ انھوں نے اس راز کو سمجھا کہ موجودہ زمانہ علمی انقلاب کا زمانہ ہے۔ اس علمی انقلاب میں یورپ کی قومیں آگے ہیں اور مسلمانوں کی پس ماندگی کا حال

یہ ہے کہ وہ ابھی تک اس علمی انقلاب میں داخل بھی نہ ہو سکے۔

سر سید احمد خاں انگلینڈ سے واپس آئے تو اس وقت کے غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کے علما اور دانشور صرف ایک ہی بات جانتے تھے اور اسی کے پرچار میں مصروف تھے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ سیاسی مسئلہ ہے۔ انگریزوں کی سیاسی بالادستی یا انگریزوں کے جانے کے بعد ہندؤں کی سیاسی بالادستی، بس یہی ایک چیز تمام مسلم ذہنوں پر سوار تھی اور مختلف صورتوں میں ہر ایک اسی سیاسی مسئلہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ (مسلم دنیا کی دوسری شخصیت جس نے یورپ کا تحقیقی سفر کیا وہ خیر الدین التونسی ہیں)

جدید ہندستان میں سرسید پہلے قابل ذکر شخص ہیں جنھوں نے کہا کہ ہمارا اصل مسئلہ سیاسی نہیں بلکہ تعلیمی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس وقت عملی سیاست میں مصروف نہ ہوں اور اس کے بجائے اپنی تمام کوشش صرف تعلیم کے محاذ پر لگا دیں :

> Sir Sayyid advised the Muslims against joining active politics and to concentrate instead on education (1/369).

سرسید کی رہنمائی نہایت صحیح رہنمائی تھی۔ مگر مسلمانوں نے سرسید کی اس رہنمائی کو قبول نہیں کیا۔ وہ تعلیمی جدوجہد کے بجائے سیاسی جدوجہد میں لگے رہے۔ اور جب رہنمائی کو اختیار نہ کیا جائے تو اس کا فائدہ کس طرح کسی کو مل سکتا ہے۔

اس معاملہ کو تقابلی طور پر سمجھنے کے لئے جاپان کی مثال لیجئے۔ ۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم گرائے۔ اس کے نتیجہ میں جاپان مغلوب ہوگیا اور اس کے اوپر امریکہ کی سیاسی بالادستی قائم ہو گئی۔ اس وقت ہیروہیٹو جاپان کا لیڈر تھا۔ اس نے جاپان کے دانشوروں اور فوجی افسروں سے مشورہ کیا۔ اکثر کی رائے یہ تھی کہ ہماری فضائی طاقت اگرچہ تباہ ہوگئی ہے۔ مگر ہماری آرمی پوری طرح محفوظ ہے۔ اس لئے ہم اپنی جنگ اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک دوبارہ ہم کو سیاسی بالادستی حاصل نہ ہو جائے۔

ہیروہیٹو بہت پڑھا لکھا اور سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ موجودہ حالات میں سیاسی اور فوجی لڑائی جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے بجائے ہم کو اپنی ساری

طاقت تعلیم کے محاذ پر لگا دینا چاہئے۔ تعلیم کے میدان میں مصروف ہونے کے لئے ہمیں امن درکار ہے۔ یہ امن ہم اسی طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ ہم فی الحال امریکہ کی سیاسی بالادستی پر راضی ہو جائیں تاکہ ہم جاپان میں ایک نئی نسل تیار کر سکیں۔ ہیرو ہیٹو نے جاپانی ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا :

We have resolved to pave the way for a grand peace for all the generations to come by enduring the unendurable and suffering what is unsufferable.

ابتدائی اختلاف کے بعد پوری جاپانی قوم نے ہیرو ہیٹو کی رہنمائی کو پکڑ لیا۔ انھوں نے تعلیم کو سپریم حیثیت دے کر اس کے حصول کی جدوجہد شروع کر دی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد صرف چالیس سال کے عرصہ میں یہ حال ہوا کہ جاپان دنیا کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ معاشرہ بن گیا۔ اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر، سب سے زیادہ باشعور اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ معاشرہ بھی۔

۱۹۴۵ میں جاپان ایک کمزور ترین ملک بن گیا تھا۔ آج جاپان ایک طاقتور ترین ملک کی حیثیت سے اپنی حیثیت منوا رہا ہے۔ اس کو آج اقتصادی سپر پاور کہا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک صحیح لیڈر کے صحیح مشورہ پر نصف صدی تک جدوجہد کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوا۔

سیاسی ٹکراؤ کو چھوڑ کر تعلیم کے میدان میں محنت کرنے کا مشورہ ہیرو ہیٹو نے جاپان کو ۱۹۴۵ میں دیا۔ سرسید احمد خاں نے ٹھیک یہی مشورہ غیر منقسم ہندستان کے مسلمانوں کو اس سے ۱۲۵ سال پہلے ۱۸۷۰ میں دیا تھا۔ مگر جاپان آج سپر پاور ہے۔ اور مسلمان منی پاور بھی نہیں۔

اس فرق کا سبب قیادت کا فقدان نہیں بلکہ قیادت کے اتباع کا فقدان ہے۔ جاپانیوں نے اپنے لیڈر کی رہنمائی کو مان لیا۔ اور اس کے حصول میں اپنی ساری توجہ لگا دی۔ مگر مسلمانوں نے اپنے لیڈر کو الزامات کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے اس کی رہنمائی کو دشمن کی چال بتا کر اسے رد کر دیا۔ وہ علم کے بجائے سیاست کے میدان میں اپنا مستقبل تلاش

کرتے رہے۔ اور جو لوگ ایسا کریں ان کے لئے وہی کچھ مقدر ہے جو موجودہ مسلم نسلوں کے یہاں آج ہمیں دکھائی دے رہا ہے۔

اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان دوسروں کو الزام دینے کا طریقہ چھوڑ دیں۔ وہ سیاسی محاذ آرائی کو ترک کر دیں۔ اور مکمل طور پر علم کے حصول کے میدان میں لگ جائیں۔ علم ہی ہر قسم کی کامیابی کی کنجی ہے۔ علم ہی تمام ترقیوں کا واحد زینہ ہے۔ علم ہے تو سب کچھ ہے۔ علم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

زندگی کی مثال الجھے ہوئے دھاگے کی ہے۔ الجھے ہوئے دھاگے کو سلجھانے کے لئے سب سے پہلے اس کا سرا دریافت کرنا پڑتا ہے۔ سرا مل جانے کے بعد سارے دھاگے کو سلجھانا آسان ہو جاتا ہے، اور اگر سرا نہ ملے تو اس کو سلجھانا سخت مشکل ہو جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے معاملات بھی الجھے دھاگے کی مانند ہو گئے ہیں۔ اس کو سلجھانے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس کا سرا دریافت کرنا ہے۔ یہ سرا بلاشبہ علم یا تعلیم ہے۔ یہی بات قرآن سے بھی ثابت ہوتی ہے اور یہی بات تاریخ کے تجربے سے بھی۔

علم آغاز عمل ہے۔ علم اگر موجود ہو تو عملی جدوجہد صحیح رخ پر چلے گی۔ اور علم اگر موجود نہ ہو تو عملی جدوجہد بھی بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

ایران کے پروفیسر پورزوائی کو ایرانی انقلاب کے بعد ایران کی حالت پر بولنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ انقلاب کے فوراً بعد لوگوں کو اس سے بہت زیادہ امیدیں ہو گئی تھیں۔ مگر اب انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ انقلاب نے شاہی حکومت کا تو خاتمہ کر دیا۔ مگر حقیقی مسائل بدستور ایران میں باقی ہیں۔ انھوں نے اس قسم کی کئی باتیں سوال کے انداز میں کہیں۔ مگر ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ آپ واقعةً پورے معنی میں ایک فلسفی ہیں کیونکہ ایک فلسفی کی تعریف یہ ہے کہ وہ سوالات اٹھائے مگر ان کا جواب پیش نہ کرے:

> You are a philosopher, in the true sense of the word. Because it is said that the philosopher is one who raises question without providing any answer.

جون ۱۹۹۲ کے آغاز میں ایران کے صدر ہاشمی رفسنجانی نے اپنے دفتر میں ایرانی مہاجرین کی ایک جماعت سے ملاقات کی۔ وہ لوگ ترک وطن کے کئی سال بعد اعلیٰ تعلیم کی وزارت کی دعوت پر ایران آئے تھے۔ زائرین میں سے ایک صاحب جو کہ ایٹمی تحقیق کے میدان میں بین اقوامی ماہر سمجھے جاتے ہیں، ان سے رفسنجانی نے پوچھا کہ اپنے سابق وطن ایران کے بارہ میں آپ کے تاثرات کیا ہیں۔ صدر کے سوال کے جواب میں ایرانی مہاجر نے جو الفاظ کہے وہ آج کل ایران میں لوگوں کے درمیان بہت گردش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا: میں نے ملک میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں دیکھی، سوا اس کے کہ شاہ اب عمامہ پہنتا ہے اور اس کے آدمیوں نے بھی اپنے لباس بدل لیے ہیں۔ نائٹ کلب سڑکوں سے منتقل ہو کر گھروں کے اندر چلے گئے ہیں، اور نفاق ایک معمول کی چیز بن گیا ہے۔ بلکہ جو شخص جتنا زیادہ مصنوعی دین داری دکھاتا ہے وہ اتنا ہی بڑا منصب حاصل کرتا ہے۔ حاضرین مجلس کے تعجب اور اضطراب کے درمیان صدر رفسنجانی نے مذکورہ شخص سے کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں:

في بداية الشهر الماضي استقبل الرئيس الايراني هاشمي رفسنجاني في مكتبه مجموعة من المغتربين الايرانيين ممن كانوا يزورون ايران بعد سنوات عديدة من الغربة بدعوة من وزارة التعليم العالي. سأل رفسنجاني احد زواره الذي يعتبر خبيرا دوليا في مجال البحوث الذرية، عن انطباعاته خلال زيارته للوطن. وجاء رد المغترب الايراني على سؤال الرئيس في عبارة تتردد حاليا في ايران بين الناس، فقال: لم اشاهد تغيرا اساسياً في البلاد سوى ان الشاه يلبس العمامة ورجاله بدلوا ألبستهم، والنوادي الليلية انتقلت من الشوارع الى داخل البيوت، والنفاق

اصبح أمراً عادياً، بل ان من يتظاهر بالتدين اكثر فانه يحصل على منصب أعلى. ووسط استغراب وربما قلق بعض الذين حضروا الاجتماع قال الرئيس لزائره انه على الحق. (المجلة، لندن، ٢٢-٢٨ يوليو ١٩٩٢)

یہی ہر اس سیاسی انقلاب کی بات ہے جو موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر لایا جا رہا ہے۔ اسلامی انقلاب ہمیشہ دعوت اور کردار سازی اور صابرانہ جدوجہد اور تدریج کے اصول پر برپا ہوتا ہے۔ جب بھی سیاسی ہنگامہ آرائی یا گن کلچر کے ذریعہ انقلاب لانے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا انجام ایران جیسا ہوگا، خواہ اس کا نام اسلامی انقلاب یا آسمانی انقلاب کیوں نہ رکھ دیا جائے۔

کانفرنس میں آنے والے ایک صاحب کو شکایت تھی کہ ان کو یہاں بلایا گیا۔ لیکن جو پیپر انھوں نے تیار کیا تھا، اس کو پڑھنے کا موقع انھیں نہیں دیا گیا۔ میں نے ان کا پیپر دیکھا تو وہ تنقیدی انداز کا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ پیس (امن) اچھی چیز ہے، مگر پیس کو انصاف کے ساتھ (with justice) ہونا چاہئے۔ آج کی دنیا میں ہر طرف بے انصافی (injustice) ہے۔ اس کے رہتے ہوئے پیس کا کوئی مطلب نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ سوچ کے فرق کا معاملہ ہے۔ آپ انقلابی (بالفاظ دیگر، متشددانہ) طریقہ میں یقین رکھتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ بے انصافی صرف لڑ کر ہی ختم ہو سکتی ہے۔ اس لئے پہلے ہمیں لڑ کر بے انصافی کو ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی پیس کا ماحول قائم ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ بے انصافی کے خلاف لڑائی چھیڑنا ایک برائی کو دوسری برائی کے ذریعہ ختم کرنا ہے۔ اس قسم کی کوشش صرف برائی میں اضافہ کرتی ہے جس کا نمونہ آپ مختلف ملکوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ لڑائی بھڑائی کا ذہن ختم کیا جائے تاکہ پیس کا ماحول قائم ہو۔ اس کے بعد ہر ایک کو موقع ہوگا کہ وہ اپنے مطلوب مقصد کے لئے کوشش کرے۔ پہلے آپ امن کا ماحول قائم کیجئے۔ اس کے بعد پرامن ذرائع سے بے انصافی کو ختم کرنے کی کوشش کیجئے۔ یہی کام کرنے کا صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ مجھ کو تو صدام حسین کا کردار پسند ہے۔ دیکھئے وہ ظالم کے خلاف ڈٹ گیا۔ میں نے کہا کہ یہ نہ کہئے کہ ظالم کے خلاف ڈٹ گیا بلکہ یہ کہئے کہ ظالم کے خلاف چیخا۔ کیونکہ صدام حسین نے جو کچھ کیا وہ کمزور کویت کے خلاف کیا۔ جیسے ہی امریکہ سامنے آیا وہ جھک کر اس کی

ہر شرط پر راضی ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ عراق میں آج بچوں کو دودھ نہیں ملتا۔ کیوں کہ امریکہ ہرطرف سے عراق کی ناکہ بندی کئے ہوئے ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی ذمہ داری امریکہ پر نہیں ہے بلکہ خود صدام حسین پر ہے۔ (البادئ اظلم)

عراق کے پاس زبردست دولت تھی۔ مگر صدام حسین نے عراق کی پوری اقتصادی طاقت کو ایک جھوٹی جنگ کی تیاری میں لگا دیا اور ملک کی ترقی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اس کے بجائے اگر وہ ملک کی ترقی کے لئے کام کرتے تو آج عراق میں اتنا زیادہ دودھ پیدا ہو رہا ہوتا کہ وہ باہر کے ملکوں کو دودھ ایکسپورٹ کرتا۔ بجائے کہ دودھ کے لئے اس کا دار و مدار تمام تر باہر کے ملکوں پر ہو جائے۔

۲۴ اکتوبر کو شام کا کھانا فلارنس کے باہر ایک ہوٹل میں تھا۔ اس کا نام ولا ویکیا رستوران (Villa Vecchia Restaurant) تھا۔ یہ فلارنس کے باہر ۱۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہ ایک پہاڑی پر سڑک کے کنارے بنایا گیا ہے۔ اس کا پورا ماحول نہایت خوبصورت ہے۔ اس نام کا مطلب ہے قدیم محل۔

کھانے کی میز پر مختلف ملکوں کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور مختلف زبانیں بولتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک صاحب سب سے زیادہ بول رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت سی زبانیں جانتے تھے اور ہر ایک سے براہ راست ربط قائم کر سکتے تھے۔ بظاہر دیکھنے میں وہ غیر اہم معلوم ہوتے تھے۔ مگر جب وہ بولنے لگے تو میز پر وہی سب سے زیادہ چھا گئے۔

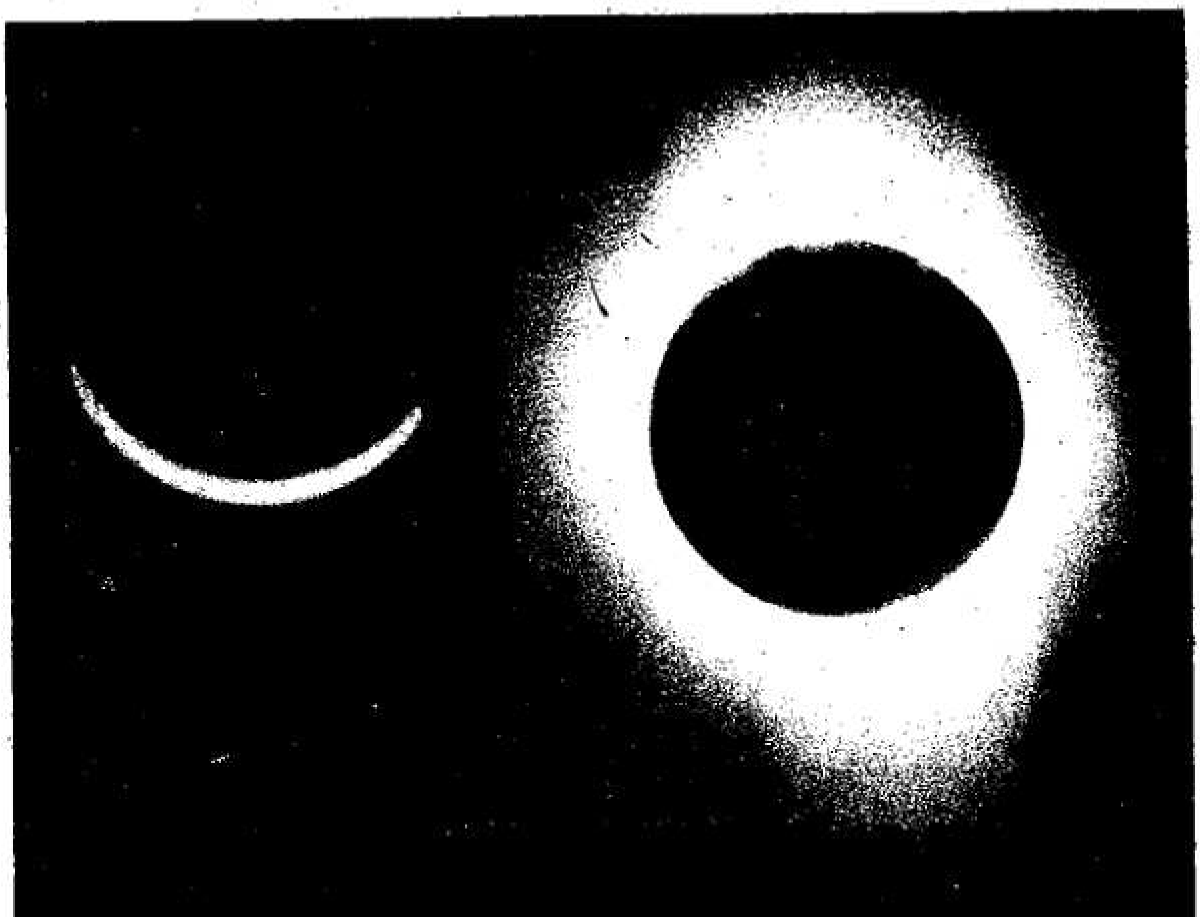
میں نے سوچا کہ انسان کا ذہن بھی کیسا عجیب و غریب ہے۔ وہ اتنا عظیم ہے کہ اس کو کمپیوٹر یا سپر کمپیوٹر کہنا بھی اس کی تصغیر کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری دنیا کے تمام کمپیوٹر مل کر بھی ایک انسانی ذہن کی برابری نہیں کر سکتے۔ یہ انسان ہے جو کمپیوٹر کی تخلیق کرتا ہے، کسی کمپیوٹر کے لئے ممکن نہیں کہ وہ انسان کی تخلیق کر سکے۔

زبان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ یہ نعمت صرف انسان کو حاصل ہے۔ زبان ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ تبادلۂ خیال کر سکتا ہے۔ حیوان ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انھیں وہ چیز حاصل نہیں ہے جس کو زبان کہا جاتا ہے۔

زبان کے ذریعہ انسانی تعلقات قائم ہوتے ہیں۔زبان کے ذریعہ جو تبادلۂ خیال ہوتا ہے وہ افکار میں ترقی کا ذریعہ بنتا ہے۔اس دنیا میں وہی لوگ زیادہ بڑا کام کرپاتے ہیں جو زیادہ زبانیں جانتے ہوں۔

۲۴ اکتوبر کو جب میں فلارنس میں تھا، مکمل سورج گرہن پڑا۔ تاہم اٹلی میں وہ قابل مشاہدہ نہیں تھا۔ہندستان میں بنگال سے لے کر راجستھان تک ایک مخصوص پٹی میں وہ دیکھا جاسکتا تھا راجستھان میں الور کے علاقہ میں سورج کو مکمل گرہن کی حالت میں دیکھا گیا۔ صبح کو ساڑھے آٹھ بجے تقریباً ۵۰ سکنڈ کے لئے چاند نے پوری طرح سورج کو ڈھک لیا۔ ذیل کی تصویر سے اس کا اندازہ ہوگا۔

اخباری رپورٹ کے مطابق، کچھ دیر کے لئے زمین پر تاریکی چھا گئی۔ستارے دکھائی دینے لگے۔ٹمپریچر اتنا گر گیا کہ لوگ سردی سے کانپنے لگے۔ جانوروں کو خوف زدہ حالت میں ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے دیکھا گیا، وغیرہ۔



قدیم زمانہ میں گرہن کے ساتھ عجیب عجیب توہماتی عقیدے وابستہ تھے۔ اسلام نے پہلی بار اس کو توہمات سے نکالا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ گرہن خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس لئے جب گرہن پڑے تو تم خدا کو یاد کرو۔

سورج گرہن کیا ہے۔ سورج گرہن دراصل یہ ہے کہ زمین اور سورج کے درمیان چاند اس طرح آجائے کہ وہ پوری طرح سورج کو ڈھک لے۔ یہ ایک نہایت عجیب واقعہ ہے کیونکہ دونوں کے سائز میں بہت زیادہ فرق ہے۔ چاند کا ڈایامیٹر صرف ۲۱۶۰ میل ہے۔ جبکہ سورج کا ڈایامیٹر ۸۶۵۰۰۰ میل ہے۔ یہ کتنا غیر معمولی حساب ہے کہ اتنے زیادہ فرق کے باوجود خلا میں دونوں ایک ایسی پوزیشن پر آجائیں کہ دیکھنے والوں کے لئے دونوں کا سائز بالکل برابر ہو جائے۔

اسی طرح اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب سورج کو چاند ڈھک لے اور وقتی طور پر زمین پر اندھیرا چھا جائے تو انسان سوچے کہ خدا اسی حالت کو اگر مستقل بنا دے تو زمین پر بسنے والے انسانوں کا کیا حال ہوگا۔ اس طرح گرہن پر غور کرنا آدمی کو خالق کی عظمت کا احساس دلاتا ہے، اور اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

یہ ۲۵ اکتوبر کی صبح ہے۔ سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی ہے۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ باہر کھلی جگہ پر بہت سی کاریں کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس میں کئی کاریں عین اسی شکل کی ہیں جن کو ہندستان میں ماروتی سوزوکی کار کہتے ہیں۔ یہ کاریں اسی سوزوکی کا اطالوی ماڈل ہیں۔ جاپان یہاں سے بہت دور ایشیا کا ایک ملک ہے۔ مگر اس کا صنعتی نفوذ یورپ کے ملکوں تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ جدید دور کی اس چیز کا کرشمہ ہے جس کو مواصلات (communication) کہا جاتا ہے۔ مواصلاتی قوت نے جدید دور میں پوری دنیا کو ایک عالمی بستی (global village) کی حیثیت دے دی ہے۔ آج زمین کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر آپ ساری دنیا میں اپنا کام پھیلا سکتے ہیں۔

یہ ایک عظیم قوت ہے جو موجودہ دنیا میں اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ دین حق کے حاملین اس کو استعمال کر کے خدا کے پیغام کو ساری دنیا میں پہنچا دیں، یہاں تک کہ حدیث کی

پیشین گوئی کے مطابق وہ وقت آجائے جب کہ خدا کا کلمہ ہر کچے اور پکے گھر میں پہنچ جائے۔ مگر عین اسی وقت ایک عجیب وغریب فتنہ مسلم دنیا میں پیدا ہوگیا۔ انھوں نے دنیا کی قوموں کو اسلام دشمن قرار دے کر ان کے خلاف جگہ جگہ سیاسی اور مادی لڑائی چھیڑ دی۔ جس کیمونی کیشن کو دعوت کے لئے استعمال کرنا تھا وہ کیمونی کیشن عداوت کے لئے استعمال ہونے لگا۔

یہ احمقانہ لڑائی آج اسلام اور ملت اسلام کے نام پر ساری دنیا میں جاری ہے۔ عالمی میڈیا نے اس کو مزید توسیع دے کر ایک ایک شخص تک اسے پہنچادیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان انتہائی غیر ضروری طور پر نفرت اور توحش کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نفرت اور توحش کی فضا میں حق کی پیغام رسانی کا کام نہیں کیا جا سکتا۔

اس احمقانہ لڑائی میں عملی طور پر اگرچہ صرف تھوڑے مسلمان شریک ہیں۔ مگر بقیہ مسلمان یا تو اس کے بارہ میں چپ ہیں یا اس کو جہاد بتانے میں مشغول ہیں۔ اس طرح سارے کے سارے مسلمان براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک جرم ہے بلکہ شاید سب سے بڑا جرم۔

چیچنیا کے بھی تین صاحبان اس کانفرنس میں آئے ہیں۔ ایک مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ ہم لوگ دوطرفہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اس وقت حال یہ ہے کہ چیچنیا کی بستیاں کی بستیاں اور شہر کے شہر تباہ ہو چکے ہیں۔ مگر عالمی ایجنسیوں کو ہم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حتی کہ عالمی میڈیا میں ہماری خبریں تک نہیں آتیں۔ دوسری طرف ہمارے جو لیڈر ہیں وہ آج بھی جنگ کی باتیں کرتے ہیں۔ ساری تباہی کے باوجود وہ خاتمہ تک جنگ (fight to finish) کا نعرہ لگاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک چیچنیا، بوسنیا، کشمیر اور اس طرح کے دوسرے تمام مقامات کا کیس ایک ہی کیس ہے۔ ہر جگہ کے لوگوں پر وہ حدیث صادق آتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص نادان کے چھوٹے شر کو برداشت نہیں کرے گا اس کو نادان کے بڑے شر کو برداشت کرنا پڑے گا۔

میں نے کہا کہ ان تمام جگہوں پر یکطرفہ اعلان آزادی سے پہلے لوگوں کو ہر قسم کے مواقع

ملے ہوئے تھے۔ البتہ ایک مسئلہ تھا جس کو آپ سیاسی مسئلہ کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے سیاسی مسئلہ کو ختم کرنے کے لئے اقدام کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹا مسئلہ بڑھ کر بہت زیادہ بڑا مسئلہ بن گیا۔

میں نے کہا کہ اس دنیا میں برائی سے خالی زندگی (evil-free life) ممکن نہیں۔ یہاں آدمی کو چھوٹی برائی (lesser evil) اور بڑی برائی (greater evil) کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ میں نے اٹلی کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ نارتھ اٹلی زیادہ خوش حال ہے اور ساؤتھ اٹلی اس کے مقابلہ میں کم خوش حالی کے مسئلہ سے دوچار ہے۔ اگر ساؤتھ اٹلی کے لوگ اس مسئلہ کو لے کر آزادی اور علیحدگی کی پرتشدد تحریک چلائیں تو ان کا مسئلہ تو حل نہیں ہوگا، البتہ وہ زیادہ بڑے اور زیادہ سنگین مسائل میں مبتلا ہو جائیں گے۔

حاضرین نے میری بات سے اتفاق کیا۔ اٹلی کے ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے میری آنکھ کھول دی۔ آپ نے نہایت سادہ طور پر ایک بہت بڑی حقیقت کو ہمیں بتا دیا۔

چیچنیا سے آنے والے مسلمانوں میں ایک صاحب وہ تھے جو عربی زبان بخوبی بول سکتے تھے۔ چنانچہ ان سے کافی گفتگو ہوئی۔ وہ ایک ریلیجس سنٹر کے چیرمین ہیں۔ وہ ادھیڑ عمر کے تھے۔ انھوں نے اپنا نام مفتی محمد بتایا:

Mufty Magomed-Khaji Albogachiev (Tel. 873-22-24312)

انھوں نے بتایا کہ موجودہ جنگ سے چیچنیا کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ کثیر تعداد میں بستیاں اور شہر تباہ ہوگئے ہیں۔ مزید تفصیل بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بظاہر روسی کسی قیمت پر چیچنیا کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تم ہمارے سیاسی اقتدار کو چیلنج نہ کرو۔ اس کے بعد ہم تم کو ہر طرح کی آزادی دینے کے لئے تیار ہیں۔ اقتصادی، تعلیمی، مذہبی، سماجی ہر میدان میں تم کو عمل کی پوری آزادی ہوگی۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہمارے خلاف تم اپنی موجودہ مسلح جنگ بند کرو۔

میں نے ان کو حضرت عائشہ کی روایت سنائی جس میں وہ فرماتی ہیں کہ ما خُیِّر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما۔ میں نے کہا کہ

آپ کے بیان کے مطابق، آپ کے لئے چیچنیا میں ایلسر کا انتخاب موجود ہے، پھر آپ اعسر کا انتخاب کیوں لئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شعب (قوم) تو اختیار ایلسر کے لئے تیار ہے۔ مگر ہمارے سیاسی لیڈر کہتے ہیں کہ مکمل آزادی سے کم کوئی چیز ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

میں نے کہا کہ یہ تو واضح طور پر پیغمبر اسلام کی سنت کے خلاف ہے۔ پھر پیغمبر کی ثابت شدہ سنت کو چھوڑ کر آپ کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے میری بات سے اتفاق کیا اور کہا کہ ہمارے لیڈر جو سخت موقف اختیار کئے ہوئے ہیں وہ ہمارے لئے اور ہماری قوم کے لئے موت ہے (ھو موت لنا ولشعبنا) یہ گفت گو مفتی محمد صاحب سے ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۵ کی شام کو فلارنس میں ہوئی۔

ایک پرجوش مسلم نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ملک میں مسلمانوں کی طرف سے چلائی جانے والی سیاسی آزادی کی تحریک میں شامل ہیں۔ میں نے کہا کہ سیاسی آزادی کی تحریک موجودہ حالات میں سراسر تباہ کن ہے۔ اور بالفرض اگر آپ کی مطلوب آزادی مل جائے تب بھی آخر کار وہ آپ کو مایوسی کے سوا کچھ اور دینے والی نہیں۔

میں نے ہندستان کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندستان پر انگریزوں کی حکومت تھی تو ہمارے لیڈر پرجوش طور پر یہ نعرہ لگاتے تھے کہ غلامی یا آزادی، دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو:

slavery or freedom, choose between the two

مگر جب ہندستان آزاد ہو گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں ابتدائی مفروضہ ہی غلط تھا۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ غلامی اور آزادی کے درمیان انتخاب کا معاملہ نہ تھا، بلکہ دیشی سیاست دانوں کی لوٹ یا بیرونی سیاست دانوں کی لوٹ میں انتخاب کا معاملہ تھا۔ چنانچہ بظاہر آزادی کے پچاس سال بعد بھی اصل مسئلہ (لوٹ) کا خاتمہ نہیں ہوا۔ جو ہوا وہ صرف یہ کہ پہلے بیرونی ملک کے لوگ ہمارے اوپر اپنے سیاسی حوصلہ کی تکمیل کر رہے تھے، اب خود اپنے ملک کے لوگ اپنے سیاسی حوصلوں کے لئے ہم کو آزمائش گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ جہاں تک عام ہندستانی کا سوال ہے، وہ آج بھی

پہلے ہی کی طرح مصائب وشدائد کا شکار ہے۔

میں نے کہا کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی انتخاب کسی اور دو چیز کے درمیان ہوتا ہے۔ مگر سطحی لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ کسی اور دو چیز میں ان کے لئے انتخاب کا موقع ہے۔ حالاں کہ وہ فرضی تمناؤں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہی آپ جیسے لوگوں کا حال بھی ہے۔

ایک روز گھومتے ہوئے ہم لوگ ایک مقام پر پہنچے۔ یہاں دریا کے کنارے ایک خوبصورت گارڈن تھا۔ رنگین پھولوں کی کیاریاں، ہرے بھرے درخت، مخصوص گھاس سے اگائے ہوئے لان، فطرت کے اتھاہ حسن کی صورت میں ہمارے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیا کوئی انسان ان پھولوں اور ان درختوں کو پیدا کر سکتا ہے۔ دل نے کہا کہ نہیں۔ یہ صرف خدا ہی کی شان ہے کہ وہ ایسی حسین دنیا کی تخلیق کر سکے۔

پھر میں نے سوچا کہ جنت تو اس گارڈن سے بے حساب گنا زیادہ خوبصورت اور بامعنی ہوگی۔ پھر کون ہے جو جنت کو اس طرح بنا سکے جس طرح دنیا میں ایک شخص اپنے لئے گھر بنا لیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان نہ تو جنت کی تخلیق کر سکتا، اور نہ کسی بڑے سے بڑے انسان کا عمل جنت کی قیمت بن سکتا ہے۔ جنت کی ناقابل بیان حد تک حسین دنیا تو صرف رحمت خداوندی سے ملے گی جس کو ملے گی۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: الا ان یتغمدنی اللہ برحمۃ منہ وفضلہ۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی آدمی صرف جنت کا طالب بن سکتا ہے۔ وہ جنت کا خالق نہیں بن سکتا۔ جنت کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک آدمی اپنے اعمال کا پرس لے کر بازار آخرت میں پہنچے اور وہاں اپنی پسند کا ایک جنتی مکان اپنے لئے خرید لے۔ جنت اس آدمی کے لئے ہے جو حقیقی معنوں میں طالب جنت ہونے کا ثبوت دے دے۔ کیوں کہ خریدار جنت بننا یا اپنے آپ کو مستحق جنت ثابت کرنا تو کسی انسان کے لئے ممکن ہی نہیں۔

فلارنس کی تین روزہ کانفرنس کے مختلف سشن مختلف مقامات پر ہوئے۔ ہم لوگ بار بار کسی نئی اور شاندار بلڈنگ میں لے جائے جاتے۔ ہر عمارت میں وقت کے جدید ترین انتظامات موجود ہوتے اور جدید قسم کے ہال میں معیاری انتظام کے تحت کارروائی انجام پاتی۔

یہ تمام اعلیٰ عمارتیں کسی نہ کسی چرچ کے ماتحت ادارے سے متعلق ہوتی تھیں۔

یہی حال ہندستان سمیت، ساری دنیا میں عیسائی حضرات کا ہے۔ انھوں نے ہر ملک میں اسٹیٹ کے اندر اسٹیٹ بنا رکھی ہے۔ کسی بھی ملک میں وہ سیاسی اقتدار کے براہ راست مالک نہیں ہیں۔ مگر غیر سیاسی شعبوں میں انھوں نے ہر وہ چیز حاصل کرلی ہے جو انھیں اپنے مذہبی وجود کے استحکام اور بقاء کے لئے درکار تھی۔

اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ یہی عیسائی قدیم زمانہ میں اس پوزیشن کے مالک نہ تھے۔ پھر آج وہ کیوں کر اس کے مالک بن گئے۔ میری سمجھ میں آیا کہ جدید فکری انقلاب نے انھیں اس کا موقع دیا ہے۔ قدیم زمانہ میں بادشاہی حکومت ہوا کرتی تھی۔ تمام چیزیں صرف ایک شخص کی ملکیت ہوتی تھیں، اور وہ بادشاہ کی شخصیت تھی۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی افکار میں جو انقلاب آیا ہے اس نے سیاسی ادارہ کو گھٹا کر صرف انتظامیہ (administration) کے درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ نظم و قانون کے محدود دائرہ کے سوا تمام شعبے عوام کے لئے کھل گئے ہیں۔

عیسائی حضرات نے اسی جدید امکان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے انتظام ملکی کے معاملہ کو سیاسی لوگوں کے لئے چھوڑ دیا۔ اور اس کے سوا جو شعبے تھے، ان میں خاموشی کے ساتھ جدوجہد کر کے ان پر قابض ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہر ملک میں ان کے شاندار ادارے قائم ہیں۔ ہمارے دانشور اس صورت حال کو چرچ کی سازش قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ ہمارے دانشوروں کی سطحیت اور ان کی خطرناک بے خبری کا نتیجہ ہے نہ کہ فی الواقع کسی سازش اور مؤامرہ کا نتیجہ۔

۲۵ اکتوبر کی صبح کو سشن میں میری نشست سے ملی ہوئی نشست پر ایک مسیحی پیشوا بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کالے رنگ کے نہایت شاندار لباس میں ملبوس تھے۔ ہاتھ میں ایک خوبصورت قسم کی کالی روزری (تسبیح) تھی۔ خود بھی نہایت شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے گلے میں خوبصورت زنجیر کے ساتھ ایک سونے کی صلیب لٹک رہی تھی۔ اس پر ایک دبلا اور ستم رسیدہ انسان مصلوب حالت میں لپٹا ہوا دکھائی دیتا تھا جو ان کے عقیدہ کے مطابق، حضرت مسیح

کی شبیہ تھی۔ یہ ایک شاندار زندگی تھی جو انھوں نے مظلوم اور مصلوب مسیح کے نام پر حاصل کر رکھی تھی۔

آجکل ہر مذہب عالی شان تجارت کا ذریعہ بن گیا ہے۔ خود مسلمانوں میں بھی مذہبی لوگ مذہب کے نام پر شاندار زندگیاں حاصل کئے ہوئے ہیں۔

آئندہ آنے والے دور کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو پیشین گوئیاں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم، میں تمہارے بارہ میں محتاجی سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تمہارے اوپر کشادہ کر دی جائے گی (فتح الباری ۶/ ۲۹۸)

اس حدیث میں مجھے صنعتی دور کی پیشین گوئی نظر آتی ہے۔ یہ دراصل صنعتی دور کا ایک ظاہرہ ہے کہ ہر طرف دولت کی فراوانی ہوگئی ہے۔ ہر آدمی کے گرد سامان دنیا کا ڈھیر لگ رہا ہے، اور اسی طرح مذہبی شخصیتوں کے گرد بھی۔ اس اعتبار سے یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ایک دلیل ہے۔

میرے ہوٹل میں جو لفٹ لگی ہوئی ہے، اس کے اندر لکھا ہوا ہے:

Capienza 4 persone

یہ اطالوی زبان میں وہی چیز ہے جس کو انگریزی میں capacity 4 persons لکھا جائے گا۔ اسی طرح قوموں کے اختلاط سے ہر زبان میں الفاظ کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ہر زبان اپنے حسب حال تلفظ بدل کر دوسری زبان کے الفاظ کو اپنے اندر داخل کر لیتی ہے۔ یہ عمل ہر زبان میں ہمیشہ جاری رہا ہے اور آج بھی جاری ہے۔

یہی معاملہ کلچر کا بھی ہے۔ کلچر کوئی مطلق یا مقدس چیز نہیں۔ وہ قوموں کے اختلاط سے بنتا ہے۔ کلچر کو قانون کے ذریعہ ڈھالا نہیں جا سکتا۔ کلچر ہمیشہ تاریخی عمل کے دوران بنتا ہے۔ ہندستان میں جو لوگ "کلچرل نیشنلزم" کا نعرہ لگاتے ہیں وہ تاریخ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ مگر اس دنیا میں کوئی بھی اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ تاریخ کے اوپر حکمراں بن جائے۔

۲۵ اکتوبر کی سہ پہر کو پروگرام کا وہ آخری جزء تھا جس کو کانفرنس کے منتظمین دعائے امن (Prayer for Peace) کہتے ہیں۔ سب سے پہلے ہر مذہب کے لوگ اپنی اپنی عبادت گاہوں میں پہنچائے گئے۔ جہاں وہ اپنے طریقہ کے مطابق عبادت کر کے امن عالم کے لئے دعا کریں۔

فلارنس کے مسلمانوں کی تعداد تقریباً تین ہزار ہے۔ پورے اٹلی میں مسلم شہریوں کی تعداد تقریباً چالیس ہزار ہے۔ ان میں سے بیشتر افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تین سال پہلے یہاں ایک مکان خرید کر اس کو مسجد کی صورت دی گئی ہے۔ ہم لوگ اسی مسجد میں پہنچائے گئے۔ یہاں ہم نے عصر اور مغرب کی نماز ادا کی۔ مراکو کے شیخ العلوی نے امامت کی۔ نماز کے بعد شیخ العلوی نے ممبر پر بیٹھ کر عربی میں ایک تقریر کی۔ تقریباً پچاس مسلمان اس میں موجود تھے۔ ہال کے کنارے دیوار سے لگ کر بہت سے مسیحی نوجوان کھڑے ہوئے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی رعایت سے ایک صاحب نے تقریر کا ترجمہ اطالوی زبان میں کیا۔ شیخ علوی نے کہا کہ اسلام سلامتی کا مذہب ہے۔ ہمارا کام قوموں سے مسالمہ ہے نہ کہ محاربہ۔ مسلمان جب دوسری قوموں کو دشمن قرار دے کر ان سے لڑیں گے تو وہ بھی ان سے لڑیں گے۔ اس لئے مسلمانوں کو ٹکراؤ سے دور رہنا ہے۔ آخر میں تقریر کا خلاصہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اسلام کے داعی بنیں (یجب علی المسلمین ان یکونوا دعاۃ للاسلام)

اس کے بعد ایک اور عالم نے مختصر تقریر کی۔ انھوں نے بھی ٹکراؤ کے بجائے پُر امن دعوت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان بنیادی طور پر سلامتی کے داعی ہیں (المسلمون هم اساساً دعاۃ السلام)

مغرب کی نماز سے فراغت کے بعد پیدل سفر شروع ہوا۔ ہر مذہب کے لوگ آکر ملتے رہے ایک بڑے قافلہ کی صورت میں ہم لوگ ایک وسیع میدان میں لے جائے گئے۔ راستہ کے دونوں طرف مقامی لوگ بڑی تعداد میں کھڑے ہوئے تالیاں بجا رہے تھے۔ یہاں نہایت وسیع پنڈال بنایا گیا تھا۔ ٹی وی کے تین چینل مسلسل تمام کارروائیوں کی تصویر کشی اور صدا بندی کر رہے تھے۔ امن کے بارہ میں تقریر اور دعا کے بعد تمام مشارکین نے امن کی اپیل پر دستخط کئے۔ آخر میں سب باہم مل مل کر ایک دوسرے کو امن کی تمنائیں پیش کرتے رہے۔

اس کارروائی کی تکمیل کے بعد تمام لوگ گاڑیوں پر کارڈینال کی رہائش گاہ میں پہنچائے گئے۔ یہ رہائش گاہ ایک شاہی محل کی مانند تھی۔ یہاں شام کا کھانا اور آخری ملاقاتیں ہوئیں۔

رات کا کھانا دیر سے کار دینال کی رہائش گاہ پر کھانے کے بعد ہم لوگ فلارنس سے روم کے لئے روانہ ہوئے۔ دونوں شہروں کے درمیان ۳۲۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ تاہم ڈیڑھ سو کیلومیٹر کی رفتار سے چلتے ہوئے ہم لوگ بارہ بجے رات کو روم پہنچ گئے۔ میں نے سوچا کہ کیا ہندستان یا پاکستان میں اس قسم کا سفر ممکن ہے۔ دل نے کہا کہ نہیں۔ حتی کہ یہی کار اور یہی ڈرائیور ہو تب بھی ہم ہندستان میں اتنا تیز رفتار سفر نہیں کر سکتے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہندستان کی سڑکیں اور وہاں کی سڑکوں کا نظام اتنا اچھا نہیں جیسا کہ یورپ کے ملکوں میں پایا جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زندگی کے سفر کا سارا معاملہ ڈرائیور کے اوپر منحصر ہوتا ہے۔ ڈرائیور جس طرح چاہتا ہے زندگی کی گاڑی کو چلاتا ہے۔ تم کسی نہ کسی طرح ڈرائیور کی سیٹ پر قبضہ کر لو، اور اس کے بعد زندگی کی گاڑی اسلام کی منزل کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ بہت سے سطحی لوگ اس نظریہ کی طرف دوڑ پڑے۔ انھوں نے پر شور جدوجہد کے ذریعہ سیاسی ڈرائیور کو دھکیل کر اسٹرنگ پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ کئی مسلم ملکوں میں ہوا۔ مثلاً مصر، ایران، پاکستان، افغانستان وغیرہ۔ مگر جلد ہی معلوم ہوا کہ ڈرائیور سمیت پوری گاڑی دلدل میں پھنس کر رہ گئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلم مفکرین اپنے ناقص فہم کی بنا پر اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ گاڑی اور ڈرائیور دونوں اگر ہمیں حاصل ہو جائیں، تب بھی اصل مسئلہ سڑک اور سڑک کے نظام کا رہتا ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو کہ سڑک بھی اچھی ہو اور سڑک کا نظام بھی، اس وقت تک منزل مقصود کی طرف کامیاب سفر ممکن نہیں۔

فلارنس سے روم آتے ہوئے ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میرے ہاتھ کی آٹومیٹک گھڑی (Seiko) ساڑھے نو بجے بند ہو گئی۔ کتنا ہی ہلایا مگر وہ دوبارہ نہیں چلی۔ روم پہنچا تو یہاں میرے قیام کا انتظام ہوٹل ہالی ڈے اِن (Holiday Inn) میں تھا۔ یہاں میں کمرہ نمبر ۳۰۴ میں ٹھہرا۔ میں نے گھڑی ہاتھ سے نکال کر میز پر رکھ دی۔ اور اس احساس کے ساتھ سو گیا کہ ابھی دہلی پہنچنے کے لئے کئی دن باقی ہیں اور بقیہ سفر میں مجھے گھڑی کے بغیر رہنا پڑے گا۔ حالانکہ گھڑی کی مجھے ہر وقت ضرورت پیش آتی ہے۔ میں نے اکثر اپنے ساتھیوں سے کہا ہے کہ تین چیزیں میری زندگی کا لازمی

حصہ ہیں —— گھڑی، قلم اور مسواک۔

صبح اٹھا تو وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے انٹر کام (in-house telephone) پر رسپشن ڈسک سے وقت دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ چھ بجکر ۳۰ منٹ۔ میں نے مایوسانہ انداز میں اپنی گھڑی اٹھائی اور اس کی سوئی کو گھمانا شروع کیا۔ حیرت انگیز بات ہے کہ سوئی جب ساڑھے چھ پر پہنچی تو وہ دوبارہ حسب معمول چلنے لگی۔

اس قسم کا ایک اور واقعہ سفر سے پہلے پیش آیا۔ سفر شروع کرنے سے چند دن پہلے میرے دانت میں سخت درد شروع ہو گیا۔ میں پریشان ہوا کہ اس حالت میں سفر کس طرح ہوگا۔ ۱۸ اکتوبر کو اللہ سے دعا کرتے ہوئے کروسین کی ایک گولی کھائی۔ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد درد ختم ہو گیا اور اللہ کے فضل سے ابھی تک دوبارہ درد نہیں ابھرا۔ حالاں کہ کروسین کی ایک گولی کے بعد میں نے اس کے لئے کچھ اور نہیں کیا تھا۔

۲۶ اکتوبر کی صبح کو جب گھڑی دوبارہ چلنے لگی تو بے اختیار دل سے دعا نکلی کہ خدایا، میری خصوصی مدد فرما۔ تو میری بند گھڑی کو دوبارہ چلا دے۔ تو میرے ابھرے ہوئے درد کو دوبارہ اچھا کر دے۔ تو میرے مضمحل قوی کو دوبارہ تندرست جسم میں تبدیل کر دے۔ تو میرے بگڑے ہوئے معاملات کو ایک ایک کر کے درست فرما دے۔

نویں صدی عیسوی میں مسلمان روم کی سرحد تک پہنچ گئے تھے۔ اٹلی کے ایک حصہ سسلی میں عیسائیوں کے درمیان باہمی لڑائی شروع ہو گئی۔ اس وقت خود سسلی کے ایک گروہ نے تیونس کے مسلم حاکم سے مداخلت کی درخواست کی۔ چنانچہ ۸۲۷ء میں بنو اغلب کی فوج سسلی (صقلیہ) میں داخل ہوئی اور وہاں امن و امان قائم کیا۔ سسلی میں مسلمانوں کی حکومت تقریباً ڈھائی سو سال تک رہی۔

اس کے بعد مسلم فوج نے اٹلی کے جنوبی حصہ میں پیش قدمی کی۔ وہ کامیابی کے ساتھ روم کی دیواروں تک پہنچ گئی۔ مگر اسی درمیان میں سسلی میں مسلمان زوال کا شکار ہوئے۔ گیارھویں صدی کے نصف ثانی میں نارمن (Normans) نے مسلمانوں کو شکست دے کر سسلی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد روم کی طرف ان کی پیش قدمی بھی ختم ہو گئی۔ مسلمانوں کی اس پسپائی کا سبب

نارمن کی فوجوں سے زیادہ خود ان کی باہمی لڑائیاں تھیں۔ اسی زمانہ میں بنو اغلب اور مصر کے فاطمیوں میں خونریز جنگ چھڑ گئی۔ اس نے مسلم محاذ کو کمزور کر دیا۔

روم کے ہوٹل کے کمرہ میں پڑھنے کی مختلف چیزیں تھیں۔ انھیں میں سے ایک ہوٹل کا میگزین (Weekender Plus) تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہالی ڈے ان کی شاخیں ساری دنیا میں ہیں اور ہر جگہ آپ ہمارے ہوٹل میں آرام کے ساتھ ٹھہر سکتے ہیں۔

اس میگزین میں رنگین تصویروں کے ساتھ مختلف ملکوں کے خوبصورت مناظر دکھائے گئے تھے جو سیاحوں کے لئے کشش کا باعث ہوتے ہیں۔ اس میں بلجیم، فرانس، چیکوسلاویکیا، جرمنی، اسپین، برطانیہ، مالٹا، اٹلی، پولینڈ وغیرہ کے ساتھ مڈل ایسٹ اور مراکو اور ترکی کا تذکرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ اس میں استانبول کی تاریخی مسجد اور بحرین اور عرب امارات کی جدید وضع کی مسجدوں کی تصویریں بھی موجود تھیں۔ مگر ۶۰ صفحہ کے اس پرچہ میں ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا نام تک بھی کہیں موجود نہ تھا۔

میں نے سوچا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جن نادان لیڈروں نے ملک کے بٹوارہ کی تحریک چلائی، اس کے بجائے وہ اس پورے خطہ کے لئے وفاقی نظام کی تحریک چلاتے تو ہماری تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ اس کے بعد ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال، بھوٹان اور مالدیپ سب مل ایک عظیم ملک بناتے۔ اور یہ وفاقی ملک عالمی نقشہ پر اتنی اہمیت اختیار کرتا کہ کسی کے لئے ممکن نہ ہوتا کہ وہ اس کو نظر انداز کر سکے۔

اٹلی میں اسی سے ملتا جلتا واقعہ پیش آیا ہے۔ پہلے اٹلی بہت سی آزاد اور خود مختار ریاستوں کا ایک کمزور ملک تھا۔ اس کے بعد یہاں کچھ مدبر پیدا ہوئے جنھوں نے یہاں اتحاد کا اندولن چلایا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج اٹلی کی صورت میں ایک بڑا ملک عالمی نقشہ پر اپنی جگہ بنائے ہوئے ہے۔

۲۶ اکتوبر کو روم میں آنکھ کے ایک ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت طے تھا۔ مجھے اپنی عینک کے سلسلہ میں ان سے مشورہ کرنا تھا۔ شہر کا بیشتر حصہ طے کر کے تقریباً پون گھنٹہ میں ہم لوگ تین بجے ڈاکٹر کے یہاں پہنچے۔ اس وقت میں حسب معمول ایک عینک لگائے ہوئے تھا۔ جب میں ان

کے دفتر میں داخل ہوا انھوں نے فوراً میری آنکھ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فوری طور پر میں سمجھ نہ سکا کہ وہ کس لئے ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ میں سمجھا کہ شاید وہ معانقہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اصل حقیقت یہ تھی کہ انھوں نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ میری عینک اتار کر اس کو فوراً کمپیوٹرائزڈ مشین میں رکھ کر اس کا نمبر چیک کیا۔ موجودہ عینک کا نمبر معلوم کرنے کے بعد مختلف مشینوں کے ذریعہ میری آنکھ کا معائنہ کرتے رہے۔ وغیرہ۔

یورپ میں عام طور پر یہی طریقہ رائج ہے، لوگ نہ اپنا وقت ضائع کرتے اور نہ آپ کا وقت۔ وہ ٹھیک مقرر وقت پر ملتے ہیں اور کسی رسمی تمہید کے بغیر فی الفور اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔

۲۶ اکتوبر کی شام کو ہالی ڈے ان میں کھانے کی میز پر ڈاکٹر پابا سے ملاقات ہوئی:

Dr Antonell Paba (Tel. 39-6-5592504)

انھوں نے اٹلی اور یورپ کی زندگی کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ کارکن عورتوں کی تعداد اٹلی میں (اور دوسرے ملکوں میں بھی) بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ عورتیں بچے پیدا کرنا پسند نہیں کرتیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں پیدائش کی شرح دن بدن گھٹ رہی ہے۔ خاص طور پر اٹلی میں پیدائش کی شرح پورے یورپ میں سب سے کم ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہماری موجودہ سوسائٹی میں نوجوان کم ہو گئے ہیں اور بوڑھے لوگ زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔

اسی طرح انھوں نے کہا کہ اب کتابیں پڑھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ زیادہ تر لوگ اب ٹی وی دیکھتے ہیں۔ "ورلڈ نیوز" کے عنوان کے تحت جب وہ خبریں سنتے ہیں تو وہ غلط طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ساری دنیا کے بارہ میں واقفیت حاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف بعض خبریں ہوتی ہیں نہ کہ کل خبریں۔ مجھ سے سی این این کے ایک آدمی نے خود کہا کہ ہم زندگی کا صرف جزئی حصہ دکھاتے ہیں:

We always show a partial aspect of life.

اس طرح ہمارا میڈیا ایک ایسی نسل بنا رہا ہے جو سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور جان رہا ہے۔ حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ بہت کم دیکھتا ہے اور بہت کم جانتا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ غریب ملکوں کے اگر مسائل ہیں تو امیر ملکوں کے بھی مسائل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر اس کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہم مسائل کے ساتھ جینا سیکھیں:

We have to learn to live with problems.

انھوں نے میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ مسائل زندگی کا حصہ ہیں۔ جب مسائل ختم ہوں گے تو زندگی بھی ختم ہو جائے گی:

When problems have finished, may be also life has.

میں روم میں پوپ جان پال دوم سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر ان دنوں ان کی طبیعت خراب تھی اس لئے ملاقات کا انتظام نہ ہو سکا۔ پوپ کا لفظ لاتینی پاپا سے بنا ہے جس کے معنی باپ کے ہوتے ہیں۔ تیسری صدی سے لے کر بعد کی صدیوں تک یہ لفظ عام پریسیٹ یا بشپ کے لئے بولا جاتا تھا۔ مگر نویں صدی عیسوی سے پوپ کا لفظ مخصوص طور پر صرف روم (ویٹیکن سٹی) کے ہیڈ کے لئے استعمال ہونے لگا۔

روم میں ایک صاحب نے کہا —— کیا آپ جانتے ہیں کہ پوپ جان پال دوم کی اہمیت کیا ہے۔ وہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ سب سے چھوٹے ملک کے ہیڈ ہیں، بلکہ اسی کے ساتھ وہ سب سے بڑی غیر حکومتی تنظیم کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں:

Do you know what is the significance of Pope John Paul II. It is not that he is the head of the smallest country. But at the same time he is also the head of the largest non-governmental organization.

۳۰ سال پہلے سکنڈ ویٹکن کونسل نے طے کیا تھا کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ ڈائیلاگ شروع کیا جائے۔ اس وقت اس سے مراد زیادہ تر یہودی اور پروٹسٹنٹ تھے۔ بعد کو ہندو اور بدھسٹ وغیرہ بھی اس میں شامل کر لئے گئے۔ اب بھی اگرچہ رومن کیتھولک چرچ ہر مذہب کے لوگوں سے ڈائیلاگ جاری رکھے ہوئے ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں وہ لوگ سب سے زیادہ مسلمانوں کو اہمیت دینے لگے ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ابھی تک حقیقی یا نتیجہ خیز

ڈائیلاگ ممکن نہ ہوسکا۔ واضح ہو کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان پچھلے ۲۰ سال سے ڈائیلاگ جاری ہے۔ میں خود بھی کئی ڈائیلاگ میں شریک ہوچکا ہوں۔ پہلا ڈائیلاگ جس میں میں شریک ہوا وہ ویٹیکن اور علماء اسلام کے درمیان فروری ۱۹۷۶ میں طرابلس میں ہوا تھا۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پچھلے ہزار سال سے ویسٹ ایشیا عالمی سیاست کا مرکز رہا ہے۔ ابتدائی صدیوں میں شام و فلسطین کے مقدس مقامات پر قبضہ کا مسئلہ اس کا سبب بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد برٹش ایمپائر کے زمانہ میں اس نزاع کا مرکز نہر سوئز کا علاقہ بن گیا۔ کیوں کہ صنعتی انقلاب نے نہر سوئز کو لائف لائن (Life-Line) کی حیثیت دے دی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اب عرب پٹرول اس کا سبب ہے۔ اور دوبارہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی صنعتی قوموں کے لئے پٹرول لائف بلڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

روم میں ویٹیکن کے زیر انتظام ایک بڑا کتب خانہ ہے۔ یہاں مختلف موضوعات پر عربی مخطوطات اور کتابوں کا بھی ایک ذخیرہ کیٹلاگ (نمبر ۱۳۸۴ عرب) کے تحت محفوظ ہے۔ ان میں ابوالحسن بن العطار (وفات ۷۲۴ ہجری) کی کتاب "ادب الخطیب" کا ایک نادر قلمی نسخہ ہے۔ یہ قلمی نسخہ اپنی قدامت اور دوسری امتیازی خصوصیات کی بنا پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ غالباً اس نوعیت کا کوئی دوسرا نسخہ کہیں اور موجود نہیں۔

الجزائر کے دکتور محمد السلیمانی نے ملاقات کے دوران بتایا کہ انھوں نے "ادب الخطیب" کے مذکورہ قلمی نسخہ کی ایک فوٹو کاپی حاصل کرکے اس کو جدید انداز میں ایڈٹ کیا ہے، اور اب وہ اس کو چھپوا کر شائع کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم ان کی خواہش ہے کہ چھپنے سے پہلے میں اس پر ایک نظر ڈال لوں اور اس کے لئے کم از کم تین صفحہ کا ایک دیباچہ لکھوں۔ ان کے شدید اصرار کی وجہ سے میں انکار نہ کرسکا۔ چنانچہ واپسی کے بعد کتاب کے ٹائپ شدہ مسودہ کو پڑھا اور ۳۱ اکتوبر کو ۳ صفحہ کا ایک عربی دیباچہ تیار کرکے بذریعہ فیکس ان کو روانہ کر دیا گیا۔

ابوالحسن ابن العطار امام نووی (شارح مسلم) کے خاص شاگرد تھے۔ زمانۂ طالبعلمی

کا بڑا حصہ انھوں نے امام نووی کی صحبت میں گزارا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اسلوبِ تحریر پر نووی کا اسلوب غالب آگیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر سوانح نگار ان کو النووی الصغیر کہتے ہیں۔

"ادب الخطیب" اصلاً ایک روایتی انداز کی کتاب ہے۔ جس میں خطیب جمعہ کے بارہ میں ضروری آداب اور شرعی احکام کو بیان کیا گیا ہے۔ (ألفتُہ فی آداب الخطیب وما یتعلق بہ من الاحکام الشرعیۃ) اس ضمن میں خطبا کو نصیحت کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ جمعہ کے خطبہ میں ترغیب وترہیب کے لئے ضعیف اور موضوع حدیثوں کو بیان کرنے سے سخت پرہیز کرنا چاہئے (ولیحذر کل الحذر من ایراد الاحادیث الموضوعۃ والضعیفۃ لقصد الترغیب... والترهیب صفحہ ۹۶) اور یہ کہ خطبہ میں مسجع عبارتوں، پیچیدہ نحوی ترکیبوں اور نامانوس الفاظ کا پر تکلف استعمال ایک ناپسندیدہ بات ہے (ویکرہ تکلف السجع فیها وتحرّي دقائق الاعراب ووحشي اللغة صفحہ ۸۲) عجیب بات ہے کہ کئی صدیوں بعد آج بھی جمعہ کے خطبے ان "مکروہات" سے پاک نہ ہو سکے۔

خطبۂ جمعہ کے بعد عموماً سامعین اور تمام اہلِ اسلام کے حق میں دعائے خیر کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ابوالحسن بن عطار کہتے ہیں کہ اس موقع پر حکامِ وقت کے لئے بھی صلاح وتوفیق کی دعا کرنی چاہئے خواہ وہ ظالم اور شریعت کے خلاف عمل کرنے والے کیوں نہ ہوں۔ (ویستحب الدعاء للحکام، وان کانوا جائرین مخالفین، ینبغی ان یدعیٰ لهم بالصلاح والتوفیق والتسدید صفحہ ۱۰۰)

آجکل مسلمانوں کے درمیان ایک نظریہ بہت مقبول ہے۔ وہ یہ کہ انسان اس سرزمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ خاص طور پر اسلام کے سیاسی شارحین اس کی زبردست حمایت کرتے ہیں کیوں کہ ان کے بقول انسان کی یہی حیثیت یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ دنیا میں انسان کا مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ وہ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے جدوجہد کرے۔ مگر خود اس نظریہ کے حق میں اب تک قرآن وسنت سے کوئی براہ راست دلیل نہیں دی جا سکی۔

ابتداءً یہ نظریہ عباسی دور میں وضع ہوا۔ اس وقت محدود طور پر صرف مسلم حکمراں کو خلیفۃ اللہ کہا جاتا تھا۔ بعد کو اس میں یہاں تک توسع کیا گیا کہ ہر انسان کو خدا کا خلیفہ کہا جانے لگا۔ تاہم محقق علماء نے تقریباً ہر زمانہ میں اس بے اصل نظریہ کی مخالفت کی ہے۔ اور یہ اعلان کیا ہے کہ مسلم حکمراں (اور اسی طرح عام انسان) کو خدا کا خلیفہ کہنا مطلق جائز نہیں۔ (اما العلماء فقالوا: لا یجوز اطلاق خلیفۃ اللہ علی القائم بامور المومنین۔ صفحہ ۱۰۷) علامہ بغوی نے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ خلیفہ کا مطلب ہے —— بعد میں آنے والا۔ انسان یا حکمراں کو خلیفہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے پیش رو کے بعد آتا ہے اور اس کا قائم مقام ہوتا ہے۔ (ویسمی خلیفۃ لانہ خلف الماضی قبلہ وقام مقامہ۔ بحوالہ ادب الخطیب صفحہ ۱۰۸) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کا نظریہ ایک خود ساختہ نظریہ ہے۔ اس کی بنیاد نہ کتاب وسنت میں ہے نہ علماء سلف کے مسلک میں۔

دکتور محمد السلیمانی نے "ادب الخطیب" کی تحقیق میں زبردست محنت کی ہے۔ کتاب کے شروع میں انھوں نے ایک مقدمہ شامل کیا ہے جس میں مستند تاریخی حوالوں سے کتاب اور صاحب کتاب کا مفصل تعارف کرایا ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر صفحہ پر نہایت مفید حواشی (تعلیقات) لکھی ہیں۔ جن کی وجہ سے کتاب کی افادیت دوگنی ہوگئی ہے۔ مصنف کی ایک رائے یہ تھی کہ جمعہ کا خطبہ صرف عربی زبان میں ہونا چاہئے۔ سریانی، فارسی، عبرانی یا کسی دوسری عجمی زبان میں خطبہ دینا درست نہیں۔ (فلو خطب بالعجمیۃ: الفارسیۃ او العبرانیۃ او السریانیۃ او غیرھا من اللغات لم تصح صفحہ ۱۰۴) اس تبصرہ کرتے ہوئے فاضل محقق نے علامہ نووی کے حوالے سے لکھا ہے کہ عربی میں خطبہ دینا مستحب ہے مگر وہ لازمی شرط نہیں کیونکہ خطبہ کا اصل مقصد وعظ ونصیحت ہے اور یہ مقصد ہر زبان کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ (مستحب ولا یشترط، لان المقصود الوعظ، وھو حاصل بکل اللغات۔ صفحہ ۱۰۴) اپنی موجودہ شکل میں یہ کتاب بلاشبہ روایتی اسلامی لٹریچر (مکتبۃ التراث الاسلامی) میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر لیونارڈو (۴۰ سال) فطری طور پر نہایت صالح انسان ہیں۔ اس بار وہی میرے گائڈ تھے۔ اس لئے ان سے کافی باتیں کرنے کا موقع ملا۔ کار میں یہاں سے وہاں جاتے ہوئے میں ہمیشہ انھیں اسلام کے تعمیری پہلوؤں کے بارہ میں کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پہلے بھی کئی بار میں آپ سے مل چکا ہوں۔ مگر اس بار میں نے آپ کو بہت زیادہ جانا اور بہت زیادہ آپ سے متاثر ہوا۔ آپ واقعی ایک مسلم مولانا ہیں۔

انھوں نے میرے بچوں کے بارہ میں دریافت کیا۔ میں نے ڈاکٹر ثانی اثنین کا تعارف کرایا۔ انھوں نے پوچھا کہ ثانی اثنین کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ دو میں کا دوسرا (second of the two) انھوں نے کہا کہ پھر میں آپ کا تیسرا شاگرد ہوں۔ میں نے کہا کہ پھر آپ تین میں سے تیسرے (third of the three) ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔

۲۶ اکتوبر کو میرے ہوٹل کے کمرہ میں مجھ سے ملنے کے لئے آئے تو میں نے کہا کہ آج رات میں نے خواب دیکھا کہ جیسے کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے:

You are striving to bring out a revolution of peace. And Dr. Leonardo is the third of the three in this noble cause.

وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ اور میں فخر کے ساتھ تین میں کا تیسرا بننے پر راضی ہوں۔

روم میں میرا قیام دو دن کے لئے تھا۔ ۲۷ اکتوبر کی شام کو مجھے ایرانڈیا کے ذریعہ دہلی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میں نے یہ پروگرام بنایا کہ ہوٹل ہالی ڈے اِن سے ایسے وقت میں نکلوں کہ روم کی مسجد اور اسلامک سنٹر کو دیکھتے ہوئے وہیں سے سیدھے ایرپورٹ چلا جاؤں۔ اس کے مطابق ڈاکٹر لیونارڈو کے ساتھ ۱۱ بجے دن میں ہوٹل سے روانگی ہوئی۔

دوپہر کو میں روم کی مسجد اور اسلامک سنٹر میں تھا۔ یہ مسجد یورپ کی سب سے بڑی مسجد ہے اور اسی کے ساتھ وہ غیر معمولی طور پر شاندار ہے۔ یہ مسجد بھی ہے اور اسی کے ساتھ اسلامک سنٹر بھی۔ اس کے باہر بورڈ پر اس کے بارہ میں ساری تفصیل لکھی ہوئی ہے۔

ایک خوبصورت تختی پر لکھا ہوا ہے کہ اس کا افتتاح ۲۱ جون ۱۹۹۵ کو ہوا۔ جس علاقہ میں یہ مرکز واقع ہے وہ روم کا نہایت عمدہ علاقہ ہے۔ دور تک سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ مسجد کا کیمپس غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ اس کے اندرونی حصہ (ہال) کو میں نے ناپا تو وہ چوڑائی میں ۷۰ قدم اور لمبائی میں ۹۰ قدم تھا۔

مسجد کے اندر پہنچ کر میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور دعائیں کیں۔ باہر نکلا تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ وہ پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کا نام کمانڈر صفدر جمیل تھا۔ وہ فرنچ نیوی میں کام کرتے ہیں۔ مسجد کے اندر اور باہر غیر معمولی پہرہ تھا۔ کافی پولیس دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کاش مسلمان ان سے کہہ سکتے کہ تم لوگ جاؤ۔ یہاں مسجد کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔

برمنگھم سے نکلنے والے ایک ماہنامہ صراط مستقیم میں اس کی خبر کی سرخی یہ تھی: مرکز عیسائیت میں منارۂ اسلام۔ لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ نوائے وقت (۲۲ اگست ۱۹۹۵) میں اس کی بابت ایک مضمون تھا جس کا عنوان یہ تھا: ”عیسائیت کے قلب میں اسلام کی فتح“ مضمون میں شکایت کی گئی تھی کہ روم کے اسلامی مرکز کی تعمیر پر مغربی اخبارات اور اٹلی کے بعض حلقوں نے ”منفی اور شر انگیز پروپگنڈہ“ کی صورت میں اپنا ردعمل ظاہر کیا ہے۔ انھوں نے اس کو مغرب کے لئے ایک خطرہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ”اسلامی مرکز“ اسلامی انتہا پسندوں“ نے بنایا ہے، اور یہ کہ ”نئی تعمیر ہونے والی مسجد میں جب اذان دی جائے تو اس کی آواز باہر نہیں سنائی دینا چاہئے اور یہ کہ آئندہ وہ روم میں کوئی دوسری مسجد تعمیر نہیں ہونے دیں گے“۔ ایک مسلم انگریزی مضمون کی سرخی یہ تھی:

Christians protest over Rome mosque

بعض عیسائی حلقہ کا یہ ردعمل در اصل خود ان پرجوش مسلمانوں کے عمل کا نتیجہ ہے جو روم میں مسجد یا اسلامی مرکز کے قیام کو ”عیسائیت کے قلب میں اسلام کی فتح“ کا نام دے رہے ہیں۔ اس زبان میں قومی بڑائی کا انداز جھلک رہا ہے۔ جب کہ اسلام تواضع کا مذہب ہے۔ یہ فطرت کا اصول ہے کہ برتری کے جواب میں برتری پیدا ہوتی ہے اور تواضع کے جواب میں تواضع۔

اسی انداز صحافت کی قیمت مسلمان بوسنیا میں ادا کر رہے ہیں۔ مگر بار بار کے تلخ تجربات کے باوجود انھوں نے اپنا یہ انداز ابھی تک تبدیل نہیں کیا۔

اس مرکز کا افتتاح ایک پر رونق تقریب میں سعودی عرب کے شاہ فہد کے بھائی امیر سلمان بن عبدالعزیز اور اٹلی کے صدر (Oscar Luigi Scaltaro) نے مشترکہ طور پر کیا۔ افتتاحی تقریب میں اٹلی کے کم و بیش تمام شہروں سے آئے ہوئے مسلمانوں کے علاوہ مختلف اسلامی ملکوں کے سفراء، سعودی عرب کے وزیر برائے دینی امور ڈاکٹر عبداللہ ترکی، رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر احمد محمد علی، مجلس شوریٰ سعودی عرب کے نائب رئیس ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے شرکت کی۔ اس تقریب کے تمام پروگرام کو نہ صرف اٹلی کے ٹیلی ویژن نے براہ راست نشر کیا بلکہ امریکی سی این این، ایم بی سی اور این بی سی، نے بھی سیٹلائٹ کے ذریعے ساری دنیا میں اس پروگرام کی تفصیلات نشر کریں۔

یورپ کے اس عظیم اسلامی مرکز کی تعمیر تیس ہزار مربع میٹر زمین پر عمل میں لائی گئی ہے۔ جس کی مسجد کے اندرونی اور بیرونی ہال میں بیک وقت چار ہزار مسلمان نماز ادا کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں دس کلاسوں پر مشتمل ایک دینی مدرسہ، ایک وسیع کانفرنس ہال، اسلامی میوزیم مرکز کے دفاتر، امام مسجد اور دیگر اسٹاف کے رہائشی فلیٹ شامل ہیں۔

اس مسجد کو شاہراہ عام سے ملانے کے لئے سعودی عرب نے پندرہ ملین ریال کے خرچ پر ایک خصوصی ذیلی سڑک بھی تعمیر کر کے حکومت کے حوالے کر دی ہے۔

روم کی مسجد اور اسلامی مرکز کے بارہ میں ایک سبق آموز بات یہ ہے کہ عیسائیوں کے ایک گروپ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ تاہم اٹلی کی حکومت نے اس کی تعمیر کی باقاعدہ منظوری دے دی۔ آخر میں انتہا پسندوں نے یہ شرط لگائی کہ مسجد کے مینار کی بلندی مقامی گرجاؤں کی بلندی سے کم رکھی جائے۔ انھوں نے کہا کہ روم میں چرچ سے اونچی مسجد بنانے سے چرچ کا تقدس مجروح ہوگا اور اس سے عیسائیوں کے دینی جذبات مجروح ہوں گے۔ اگرچہ اس مسجد کی پشت پر سعودی عرب سمیت بیشتر عرب ممالک کی حمایت تھی۔ اس کے باوجود عیسائیوں کی اس شرط کو مان لیا گیا۔ چنانچہ مسجد کی وسعت کے اعتبار سے

اس کا مینار نسبتاً بہت کم اونچا ہے۔

مسلمان اس حقیقت پسندی کو عام طور پر یورپ اور امریکہ میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے وہ وہاں کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر دوسرے ملکوں میں بھی یہی حقیقت پسندی اختیار کر لی جائے تو یہاں بھی شاندار اسلامی زندگی کی تعمیر کے تمام مواقع ان کے لئے کھل جائیں گے۔

روم کی مسجد اور اسلامی مرکز کو دیکھنے کے بعد وہاں سے ہم لوگ سیدھے ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ روم ایئرپورٹ پر میں نے وضو کر کے عصر کی نماز پڑھی۔ اٹھ کر چند قدم چلا تھا کہ ایک صاحب میرے رفیق ڈاکٹر لیونارڈو کے پاس کھڑے ہوئے نظر آئے۔ میں ان کو پہچانتا نہ تھا۔ غالباً وہ اٹلی سے تعلق رکھتے تھے۔ ممکن ہے انھوں نے مجھ کو کانفرنس میں دیکھا ہو۔ مگر میں ان سے واقف نہ تھا۔ میں نماز پڑھ کر اٹھا تو انھوں نے کسی تمہید کے بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا:

You are the only religious man all over the world.

مذکورہ آدمی نے جب یہ بات کہی تو وہ اور ڈاکٹر لیونارڈو قریب قریب کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے سمجھا کہ وہ شاید ڈاکٹر لیونارڈو کے ساتھی ہیں۔ مذکورہ جملہ کہنے کے بعد ہی وہ وہاں سے چلے گئے۔ میں نے ڈاکٹر لیونارڈو سے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں بھی ان کو نہیں جانتا۔ مذکورہ جملہ کے سوا کوئی اور بات انھوں نے مجھ سے بھی نہیں کہی۔

روم ایئرپورٹ پر میرے ساتھ وہی قصہ پیش آیا جو اکثر میرے ساتھ پیش آتا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے میں اپنے آپ کو آخری حد تک "غیر اہم" انسان سمجھتا ہوں۔ اسی احساس کے تحت یہاں میں نے عام باتھ روم میں وضو کیا اور کھلی زمین پر کھڑے ہو کر نماز پڑھ لی۔ تھوڑی دیر بعد ایک صاحب آئے۔ انھوں نے مجھ کو لے جا کر وی آئی پی لاونج میں بٹھا دیا۔ انھوں نے نہ صرف خاطر تواضع کا انتظام کیا بلکہ میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ لے کر ساری ضروری کارروائی مکمل کر دی۔

اگر میں پہلے سے جانتا تو لاونج میں پہنچ کر نماز پڑھتا۔ کیوں کہ یہاں ہر طرح کی عمدہ سہولت

موجود تھی۔ مگر شاید اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ میں اس کے لئے قالین پر سجدہ نہ کروں۔ بلکہ اس کے بجائے کھلی زمین پر سجدہ کروں۔ ایئرپورٹ پر جن صاحب نے تمام انتظامات کئے وہ ایئر انڈیا کے پی آر او مسٹر کے جی دیشمکھ تھے:

K.G. Deshmukh, Rome (Tel. 65010741,. 5663483)

ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کا طریقہ کیا یورپ کی سوسائٹی میں قابل قبول ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ میں نے کہا کیوں۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کہا جاتا ہے کہ اس طرح نوجوانوں کو زندگی کا تجربہ حاصل ہوگا۔ میں نے کہا کہ تجربہ تو نہیں حاصل ہوگا۔ البتہ یہ نوجوانوں میں سطحیت اور نفس پرستی پیدا کرے گا۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ ہاں آپ کی بات درست ہے اور عملاً آج یہی ہو رہا ہے۔

روم سے ایئر انڈیا کی فلائٹ ۱۷۸ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ایئر پورٹ سے نکل کر جہاز کے قریب پہنچا تو اس کی مخصوص سیڑھی کے پہلے زینہ پر لکھا ہوا تھا —— سیڑھی جب تک اپنی آخری پوزیشن تک نہ پہنچ جائے اس پر قدم نہ رکھیں:

Do not step in before final positioning.

اس دنیا میں ہر صحیح اصول یونیورسل اصول ہوتا ہے۔ یہ بھی بلاشبہ ایک یونیورسل اصول ہے۔ ہوائی جہاز کی سیڑھی اس کے دروازہ کے ٹھیک سامنے پہنچ کر اس سے جوڑ دی جاتی ہے۔ اگر اس سے پہلے کوئی شخص سیڑھی پر چڑھنے لگے تو وہ ایک خطرناک کام ہوگا۔ اسی طرح زندگی کے معاملات میں ابتدائی تیاری کا عمل جب تک آخری تکمیل تک نہ پہنچ جائے، کوئی اقدام کرنا سخت مہلک ہے۔ اس قسم کا نیم پختہ اقدام تباہی کی طرف لے جاتا ہے نہ کہ کامیابی کی طرف۔

جہاز اپنے وقت پر چلنا شروع ہوا۔ مگر کچھ دور جا کر رک گیا۔ اس کے بعد آواز آئی: میں آپ کا کیپٹن بول رہا ہوں۔ ابھی ہماری پرواز میں دس منٹ کی دیر ہوگی۔ کیوں کہ ترتیب میں ہم نمبر ۴ پر ہیں:

We are number 4 in the sequence.

یعنی تین جہاز جب اڑ چکے ہوں گے تب ہم کو رن وے ملے گا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہمارا پائلٹ

اس ترتیب کی پروا نہ کرے۔ وہ کہے کہ میں ترتیب میں نمبر ۲ نہیں بن سکتا۔ میں تو نمبر ایک ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنا جہاز رن وے پر دوڑا دے تو کیا ہوگا۔ وہ خود بھی تباہ ہوگا اور دوسرے جہازوں کے لیے بھی تباہی کا سبب بن جائے گا۔

جہاز میں کچھ مخصوص سامان ڈیوٹی کے بغیر اصل قیمت پر ملتا ہے۔ ڈیوٹی فری کی گاڑی مسافروں کے درمیان گھومتی ہوئی میرے پاس پہنچی تو اس کے آدمی نے کہا: " آپ کو ڈیوٹی فری شاپ سے کچھ خرید لینا ہے"۔ اس قسم کی غلطیاں ہر آدمی اپنی غیر مادری زبان میں کرتا ہے۔ بہت ہی کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو غیر مادری زبان میں اس قسم کی غلطیاں نہ کریں۔ ہندستان میں لوگ انگریزی زبان بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر بیشتر ہندستانیوں کی زبان میں اسی قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں جس کی ایک مثال مذکورہ اردو جملہ میں نظر آتی ہے۔

روم میں ایک شخص نے مجھ سے ایک انگریزی لطیفہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ انگریزی زبان برطانیہ میں پیدا ہوئی، امریکہ میں اس نے ترقی کی۔ افریقہ پہنچ کر وہ بیمار ہوئی اور انڈیا میں وہ مرگئی:

English language was born in Great Britain, grew in USA, became sick in Africa, and died in India.

میں نے کہا کہ اس قسم کے لطیفوں میں ہمیشہ مبالغہ ہوتا ہے۔ اور یہ لطیفہ بھی یقیناً مبالغہ سے خالی نہیں۔

روم سے دہلی آتے ہوئے راستہ میں انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون کا شمارہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس کے صفحہ اول کی پہلی خبر بوسنیا کے بارہ میں تھی۔ یہ بوسنیا کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی دردناک کہانی تھی جو صفحہ اول سے شروع ہوکر دوبارہ صفحہ ۸ پر ختم ہوئی تھی۔ اس میں جو باتیں تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ سرب فوجیں بوسنیا کے مسلمانوں کو پکڑ کر لے جاتی ہیں۔ ان کو وحشیانہ طور پر مارتی پیٹتی ہیں اور بہت سے لوگوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیتی ہیں۔ ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک گانا گائیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ —— یہ ملک کس کا ہے۔ یہ سربوں کا ملک ہے۔ وہ ہمیشہ سے سربوں کا تھا اور ہمیشہ انھیں کا رہے گا:

Whose country is this? This is Serbian land. It always was, and it always will be.

بوسنیا کے جوشیلے مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے حالات کا لحاظ کئے بغیر آزادی کا اعلان کر دیا۔ مزید یہ کہ اس یکطرفہ اعلان آزادی میں انھوں نے اپنے پڑوسی کروا تیوں کو ساتھ نہیں لیا۔ بوسنیا میں اب مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ دراصل اسی جذباتی سیاست کے نتائج ہیں۔

جہازوں میں خاص طور پر اوپر کے درجہ میں، شراب نہایت فیاضی کے ساتھ فراہم کی جاتی ہے۔ ایک آدمی اپنے ہاتھ میں ایک بوتل لے کر آیا۔ اس نے کہا: "آپ کو شراب پینا ہے۔" مجھے اس آدمی کو جواب دینا عجیب سا لگا۔ میں نے سوچا کہ کاش مسلمانوں کی تصویر ساری دنیا میں یہ ہوتی کہ وہ شراب نہیں پیتے۔ اور جہاز کا عملہ بتائے بغیر پیشگی طور پر محض صورت دیکھ کر جان لیتا کہ یہ مسلمان ہے۔ یہ شراب نہیں پئے گا۔ مگر بدقسمتی سے آج مسلمان کی یہ تصویر دنیا میں نہیں۔

میری سیٹ کے سامنے دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں بڑے تاجر تھے اور آپس میں تجارتی گفتگو کر رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی لفظ میرے کان میں بھی آجاتا تھا۔ مثلاً اس طرح کے الفاظ:

1 million dollars, 60 million dollars, 100 million dollars.

کبھی یہ لفظ سنائی دیا کہ اس میں بہت فائدہ ہے۔ میں نے سوچا کہ آج ہر آدمی صرف ایک چیز کی طرف دوڑ رہا ہے، اور وہ دولت ہے۔ دولت ہی آج کے انسان کا حقیقی خدا ہے۔ ہندو بدنام ہیں کہ انھوں نے دولت کو "لکشمی" کے نام پر خدا بنالیا ہے اور اس کو پوجتے ہیں۔ مگر آج کون ہے جو دولت کا پرستار نہ ہو۔ حتیٰ کہ مسلمان بھی اس معاملہ میں دوسروں سے پیچھے نہیں۔

میرے دائیں طرف کی سیٹ پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ دیر تک ہم لوگوں میں کوئی کلام نہیں ہوا۔ آخر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں۔ کہاں رہتے

ہیں وغیرہ۔ جب میں نے کانفرنس کا نام لیا تو انھوں نے پوچھا کہ کیا آپ امام ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ کیا آپ پریسٹ ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ وہ مسلم امام اور عیسائی پریسٹ سے واقف تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ مجھے انھیں دو میں سے کوئی ایک ہونا چاہئے۔

اسی طرح ہر آدمی اپنے ذہنی سانچہ کے لحاظ سے دوسروں کے بارہ میں رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر رائیں واقعہ کے مطابق نہیں ہوتیں۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک پرائیویٹ ایئر کمپنی کے مالک ہیں۔ اس وقت ہندستان میں تقریباً دس پرائیویٹ کمپنیاں ہیں۔ ان کی کمپنی کا نام یہ ہے :

Jagson International Limited.

یہ نام انھوں نے اپنے نام پر بنایا ہے۔ ان کا نام ہے جگدیش گپتا۔ ان کا ایک لڑکا ہے۔ انھوں نے اپنے نام کا جگ لے کر جیگ سن (Jagson) بنالیا۔ اس طرح ان کی کمپنی کا نام بظاہر یورپی دکھائی دینے لگا۔

نام رکھنے کا یہ طریقہ مسلمانوں میں بھی اسی طرح رائج ہے۔ چنانچہ آجکل مدرسوں اور مسلم اداروں کے نام کثرت سے اس ڈھنگ سے رکھے جاتے ہیں جو عربوں جیسے دکھائی دیں۔ مسلمانوں میں یہ رواج کسی اسلامی داعیہ سے نہیں آیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ "پٹرو ڈالر" کے ظہور کے بعد یہ طریقہ رائج ہوا ہے۔ اس سے پہلے اس کا رواج ہمارے یہاں موجود نہ تھا۔

اپنی عادت کے مطابق میں مسٹر جگدیش سے ان کے اپنے میدان کی باتیں کرنے لگا۔ ان سے میں نے پوچھا کہ پرائیویٹ کمپنیوں کے جہاز ہمیشہ ٹھیک وقت پر چلتے ہیں۔ جب کہ انڈین ایئر لائنز کے جہاز اکثر لیٹ ہو کر روانہ ہوتے ہیں۔ اور نتیجۃً دیر میں اپنی منزل پر پہنچتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "پرائیویٹ کمپنیوں کو سروائو کرنا ہے۔ جب کہ انڈین ایئر لائنز کو معلوم ہے کہ اس کو سرکار سے سبسڈی ملے گی۔ مدد کا یقین نہ ہو تو آدمی سخت چوکنا رہتا ہے۔ مگر جس آدمی کو مدد کا بھروسہ ہو وہ کبھی چوکنا نہیں رہے گا۔

مسٹر گپتا کی کمپنی اپنے جہاز فیڈر روٹ (feeder routs) پر چلاتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ پرائیویٹ کمپنیوں میں کچھ وہ ہیں جو ٹرنک روٹ پر اپنے جہاز چلاتی ہیں۔ وہ عام

طور پر گھاٹے پر چل رہی ہیں۔ مگر جو کمپنیاں فیڈر روٹ پر اپنے جہاز چلاتی ہیں وہ نفع پر چل رہی ہیں۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ ٹرنک روٹ پر ان کا مقابلہ انڈین ایرلائنز سے ہے۔ جب کہ فیڈر روٹ پر اس قسم کا مقابلہ نہیں۔ اگر ہے تو باہمی طور پر پرائیویٹ کمپنیوں سے ہے نہ کہ انڈین ایرلائنز سے۔

دہلی اور روم میں گھڑی کے لحاظ سے ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق تھا۔ دہلی میں جب میں اترا تو یہاں کی گھڑی اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ جب کہ اس وقت روم کی گھڑیوں میں ایک بجے رات کا وقت تھا۔ اسی طرح دونوں میں موسم کا بھی غیر معمولی فرق تھا۔ ۲۸ اکتوبر کو ہمارا جہاز دس ہزار میٹر کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا دہلی پہنچا تو یہاں کا ٹمپریچر اس وقت ۳۰ ڈگری تھا۔ جب کہ روم میں اترنے کے وقت جہاز کے اندر اعلان کیا گیا کہ باہر کا درجۂ حرارت ۱۰ ڈگری ہے۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۹۵ کی صبح کو ساڑھے پانچ بجے میں دہلی ایرپورٹ پر اترا۔ جہاز میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جو اب بھی میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میرے کیبن میں ایک مسافر تقریباً میری عمر کا تھا۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ کچھ دیر کے بعد اچانک کوئی بھاری چیز گرنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو وہ آدمی بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ جہاز کا عملہ اور ایک ڈاکٹر دیر تک اس کو دوبارہ ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کو ایک سلنڈر کے ذریعہ مزید آکسیجن دیا گیا۔ آخر کار دہلی کے قریب پہنچ کر وہ ہوش میں آگیا۔ تاہم دہلی ایرپورٹ پر اس کو اسٹریچر کے ذریعہ اتارا گیا اور غالباً سیدھے اسپتال لے جایا گیا۔

میں نے سوچا کہ اس مسافر کا دنیا کا سفر ممکن ہے کہ آخرت کا سفر بن گیا ہو۔ یہی امکان ہر ایک کے لئے ہے۔ شاعر کی زبان میں یہاں "آج وہ کل ہماری باری ہے" کا معاملہ ہے۔ اگرچہ ایسے کسی واقعہ کو دیکھ کر لوگ اس کو دوسرے کا معاملہ سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو ایسے واقعات میں اپنی تصویر دیکھیں، جو آنے والے دن کو پیشگی طور پر خود اپنے لئے جان لیں۔

سفر سے واپسی کے بعد میں نے محترم جناب حبیب بھائی صاحب (حیدرآباد) کے

نام ایک خط روانہ کیا تھا۔ یہ خط ۵ نومبر ۱۹۹۵ کو لکھا گیا تھا۔ ذیل میں اس خط کا مضمون نقل کیا جا رہا ہے۔

"حال میں میں اٹلی گیا تھا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۵ کو یہاں سے روانہ ہوا اور ۲۸ اکتوبر کو واپسی ہوئی۔ اس مدت میں روم اور فلارنس وغیرہ میں خطابات اور ملاقاتوں کا موقع ملا۔ ایک موقع پر آپ بہت یاد آئے۔ اسی یاد کے زیر اثر یہ خط لکھ رہا ہوں۔

فلارنس میں ایک سو چرچ اور مسیحی ادارے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑے چرچ نے اپنے مخصوص ہال میں میری تقریر رکھی تھی۔ اس کا موضوع تھا : اسلام کیا ہے۔ میں نے انگریزی میں تقریر کی۔ جس کا ترجمہ فوری طور پر یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے اٹالین زبان میں کیا۔ تقریر کے بعد کافی دیر تک سوال وجواب کا پروگرام رہا۔

اس پروگرام کے بعد ایک تعلیم یافتہ عیسائی نے کہا کہ اب تک ہم اسلام کے بارہ میں اتنا ہی جانتے تھے جتنا ہم نے ٹی وی میں دیکھا اور سنا تھا۔ آج پہلی بار معلوم ہوا کہ اسلام کیا ہے۔ ایک اور عیسائی نوجوان نے کہا کہ آپ کی تقریر سن کر میرے اندر یہ شوق ابھر آیا کہ میں اسلام کا مطالعہ کروں۔ اسلام واقعی جاننے کے قابل ہے۔

یہ تجربات کوئی سادہ تجربات نہیں ہیں۔ وہ آپ کو نہایت اعلیٰ روحانی کیفیات سے آشنا کرتے ہیں۔ ان تجربات کے دوران آدمی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کے سامنے خدا کی نمائندگی کر رہا ہے، وہ من انصاری الی اللہ (الصف ۱۴) کی پکار کا جواب بن رہا ہے۔ یہ بلاشبہ تبتل کا ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اس موقع پر آپ کی یاد اس طرح آئی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ صلاحیت دی ہے۔ آپ اس اعلیٰ روحانی کیفیت کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس عظیم تر دولت کے کمانے کے لئے منتخب کر لے۔ کیوں کہ اس سے بڑی دولت اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

اُردو

	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
طلاق اسلام میں	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتاب زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
فکر اسلامی	50/-

تارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعددِ ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-

ھندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتِک واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پُنرجیون	8/-
منزل کی اور	3/-

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	8/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam And Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہؐ کا طریقِ کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

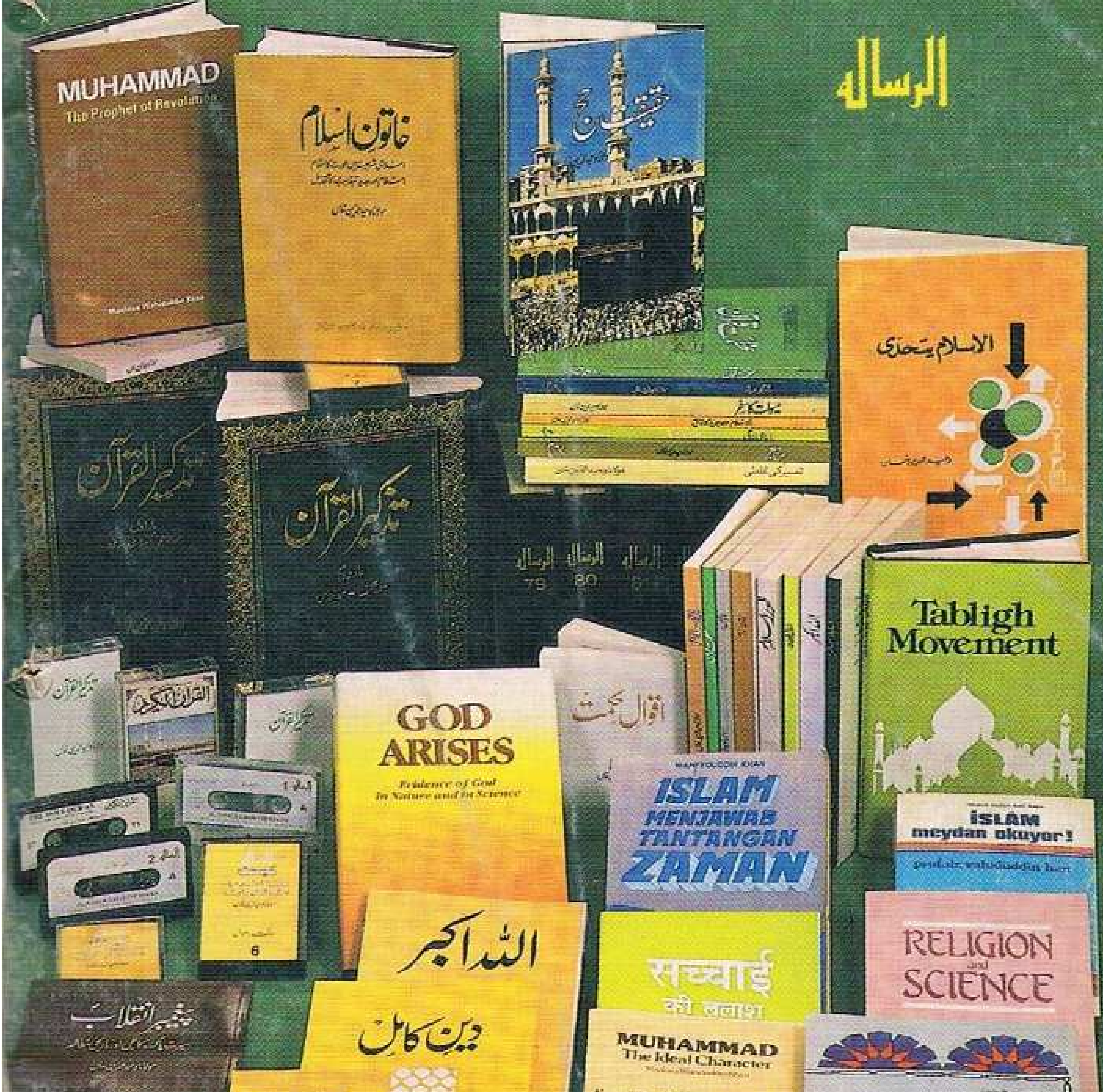
۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	£50 / $100	

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

الرسالہ



AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333

RNI 28822/76 U(SE) 12/96
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/96